باب ۱

مسئلہ کی بازیافت

طریقۂ کار اور بنیادی مباحث

﴿هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَايَعْلَمُوْنَ﴾

اسلام بنیادی طور پر ایک کلمہ ہے، ایک ایسا کلمہ جو اگر فرد کے دل و دماغ میں جاگزیں ہوجائے تو اس کے اردگرد خوشگوار تبدیلیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری کردے۔ اسے محض کسی انقلابی خیال پر محمول کرنا بھی سادہ لوحی ہوگی اور اس کی اصل ماہیت کے ادراک سے ہمیں دور کردے گی۔ اس کلمہ کا سب سے اہم پہلو فرد کا ناقابل تسخیر آسمانی قوتوں سے تعلق قائم کرنا بھی ہے، جس کے بعد فرد محض ایک فرد نہیں رہ جاتا بلکہ کائنات اس کے تصرف میں آجاتی ہے: ﴿الیه یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعه﴾۔ وہ خود کو خلیفۃ اللہ فی الارض کے منصب پر مامور پاتا ہے۔ تاریخ اس کے اشارے پر چلتی معلوم ہوتی ہے، واقعات کی ترتیب اس کے عزائم کے تابع ہوجاتی ہے اور مشاہدین کو واضح طور پر محسوس ہونے لگتا ہے کہ نصرت الٰہی کے طفیل اس قسم کے افراد نے دنیا کی تقدیر کو اب اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے۔

یہ کلمہ جسے عصری اصطلاح میں نظری یا فکری قوت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے دراصل اس یقین سے کہیں آگے کی چیز ہے جو مختلف قوموں میں ان کی تاریخ کے زمانۂ عروج میں دیکھنے کو ملتا ہے اور جس کے ذریعہ حامل یقین قومیں اپنے مفروضہ عقائد کے سہارے فتوحات اور کامیابی کی داستانیں رقم کرلیتی ہیں۔ اہل یہود کا یہ یقین کہ وہ خدا کی برگزیدہ اور منتخب قوم ہیں، انھیں انتہائی سنگین حالات میں بھی بچ نکلنے اور دشواریوں کو انگیز کرنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ کمیونسٹوں کا یہ یقین کہ تاریخ کا جبر یا dialectical materialism کا خدا ان کی پشت پر موجود ہے جس کے نتیجے میں جدوجہد کا منطقی نتیجہ اب صرف ان کے حق میں ہی نکلے گا۔ یا انیسویں صدی کے یورپی استعمار کے بڑھتے سیلاب کا اس یقین سے تقویت حاصل کرنا کہ سفید نسل کو ایشیاء

اور افریقہ میں خدا کی طرف سے تہذیبی مشن پر مامور کیا گیا ہے، دراصل صرف یقین کی مثالیں ہیں جو اس بات پر دال ہیں کہ الٹے سیدھے خیالات بھی اگر یقین کامل کا روپ اختیار کرلیں تو وہ قوموں کی تاریخ نئے انداز سے لکھ سکتے ہیں۔ البتہ ہم اسلام کو جن معنوں میں کلمہ قرار دیتے ہیں وہ کسی نظری قوت اور یقین واثق سے بہت آگے کی چیز ہے۔ اس کا بنیادی فریضہ محض یقین کی جوت جگانا یا کسی نسبتاً advanced ideology کو وجود میں لانا نہیں بلکہ کائنات کے سرّی نظام اور مکافات کے اصولوں سے ایک ایسا تعلق پیدا کرلینا ہے جس کے نتیجے میں فرد خود کو اس سرزمین پر ربّ ذوالجلال کا ایجنٹ اور خلیفہ محسوس کرتا ہے۔ خود کو من جانب اللہ مامور پاتا ہے، جس کا کام کارِ رسالت سے عبارت ہے اور جس کی انجام دہی میں اس کے لئے خالق کائنات کی نصرت وحمایت اسے ہر لحہ اپنے اردگرد مرئی شکلوں میں محسوس اور مشاہد نظر آتی ہے۔

انبیاء کا ظہور ایک کلمہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ معاونین اور ناصرین کی فوج لے کر نہیں آتے۔ ایک بات، ایک نعرہ، ایک کلمہ یا ایک انقلاب انگیز خیال اسے جو بھی نام دیا جائے یہی وہ بنیادی وصف ہے جو انہیں زمینی انقلابیوں اور باجبروت حکمرانوں سے ممتاز کرتا ہے۔ یہ کلمہ کہنے کو تو ایک بات ہے لیکن چونکہ اس اظہار کلمہ کے نتیجے میں زمین کا آسمان سے تعلق قائم ہوجاتا ہے بظاہر کمزور و بے بس نظر آنے والے نفوس کی پشت پر تائیدِ الٰہی آ کھڑی ہوتی ہے اس لئے اس ایک کلمہ کا مقابلہ بڑی بڑی باجبروت حکومتیں نہیں کر پاتیں: ﴿أصلها ثابت و فرعها في السماء﴾ مکہ میں رسول اکرمؐ کے ذریعے جب اس کلمہ کا اظہار ہوا تو بہت کم لوگ اس کے اسرار وعواقب کو سمجھ پائے، دانشورانِ قریش کا ایک بڑا حلقہ اسے صرف ایک خطرناک سیاسی اور سماجی نعرہ کے طور پر دیکھ سکا۔ دارالندوہ میں زعماء قریش کے زیر بحث یہ بات تو آ گئی کہ محمدؐ نے جو نعرہ پھینکا ہے وہ بڑا زبردست ہے، خیال اور نظریے کی سطح پر اس کا مقابلہ ممکن نہیں، غلام اور آقا سبھی برابر۔ لیکن یہ اس پیغام یا کلمہ کا صرف سیاسی یا سماجی پہلو تھا، جہاں دانشورانِ قریش کی نگاہیں الجھ کر رہ گئیں۔ کلمہ کا وہ پہلو جو زمین کا آسمان سے تعلق قائم کرتا تھا، فرد کے وجود میں الٰہی تجلیوں کا spark جو اسے ناقابل تسخیر قوت میں تبدیل کئے دے رہا تھا، اس حقیقت کا ادراک بہت کم لوگوں کو ہوسکا[۱]۔ اور یہ ہے بھی ایسی کیفیت جو ہر خاص و عام کے مشاہدے میں آسانی سے نہیں آسکتی۔ تیرہ سال کی سخت جدوجہد کے نتیجے میں صرف ڈھائی تین سو لوگ ہی اس کلمہ کا واقعی ادراک کر پائے۔

رسول اکرمؐ کی موجودگی میں تاریخ ایک غیر معمولی اور exceptional تجلیات کی زد میں تھی۔ خدا کا آخری رسولؐ اس سرزمین پر بہ نفسِ نفیس موجود تھا جسے قدسیوں کا ایک ایسا گروہ تیار کرنا تھا جو انسانی تاریخ

کوکلمہ کے اسرار و رموز سے آ گاہ کر سکے، فرد کا خالق سے ایک ایسا تعلق قائم ہوسکتا ہے کہ کائنات اس کے تصرف میں آ جائے اور تاریخ کی تکمیل اس کی مٹھی میں دے دی جائے۔ محمدؐ کا مشن زمانی اور مکانی قیود سے آزاد تھا کہ انھیں آخری رسولؐ کی حیثیت سے رہتی دنیا تک کے لئے کلمہ کی اس کیفیت کو متوارث کرنا تھا تا کہ تاریخ کے جس مرحلے میں بھی اندھیرا سخت ہوجائے، قدسی نفوس کلمہ کے اس spark سے زمین کا آسمان سے تعلق قائم کرسکیں اور پھران کے لئے تاریخ کو اپنی متعینہ سمت میں لے چلنا ممکن ہو۔ محمدؐ نے اپنا کام بہ تمام وکمال انجام دیا۔ قدسیوں کا ایک ایسا گروہ وجود میں آیا جو انتہائی مختصر مدت میں عالمی تاریخ کو اپنی پسندیدہ سمت میں موڑ دینے میں کامیاب ہوگیا۔ کلمہ کی یہ قوت انہیں دنیا کے مختلف حصوں میں لے گئی۔ کوئی ایسی معروف تہذیب اور خطہ نہ رہا جہاں اس پیغام نے اپنے اثرات مرتب نہ کئے ہوں۔ لیکن رفتہ رفتہ جب قدسیوں کا یہ گروہ دنیا سے رخصت ہوگیا اور بعد کی نسلوں میں کلمہ کی وہ کیفیت باقی نہ رہی اور خود اس کلمہ پر تاریخ وروایات کی گرد پڑتی گئی تو زمین کا تعلق آسمان سے کمزور ہوتا گیا اور پھر ایسا محسوس ہونے لگا جیسے تاریخ ہماری مٹھی سے پھسلتی جارہی ہو۔ آج جب اس واقعہ پر کوئی چودہ صدیاں بیت چکی ہیں۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ تو ہماری مٹھی میں کیا ہوتی خود ہمارا وجود اب آثار تاریخ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور ہم من حیث الامت ایک تاریخی مطالعہ کا موضوع بن چکے ہیں۔

انسانی تاریخ کا یہ تنہا اور حیریت انگیز واقعہ ہے جب مٹھی بھر بادیہ نشینوں نے محض ایک کلماتی قوت کی بدولت انتہائی مختصر سی مدت میں وقت کی دو بڑی مستحکم اور منظّم سُپر پاور کو نہ صرف یہ کہ الٹ پھیکا بلکہ اس کی جگہ ایک متبادل نظام قائم کرنے میں بھی انتہائی اولوالعزمی کا ثبوت دیا۔ تاریخ کا یہ حیرت انگیز واقعہ آج بھی ماہرین تاریخ کے لئے اسی قدر حیرت واستعجاب کا باعث ہے اور یہ ہمیشہ رہے گا تاریخ کو اس انداز سے موڑ دینا محض نظری قوت کے بل بوتے پر ممکن نہ تھا جب تک کہ اس کی پشت پر تائیدِ ایزدی موجود نہ ہو۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایران وروما کی سلطنتوں کا زوال بہت کچھ ان کے اندرونی تضادات contradiction میں مضمر ہے اور یہ کہ اسلام کو دراصل ان بوڑھی تہذیبوں کے مقابلے میں کسی خاص مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا وہ شاید اس بات کو نظر انداز کئے دیتے ہیں کہ اسلام نے صرف ان empires کو ختم ہی نہیں کیا بلکہ اس کی جگہ ایک ایسا متبادل بھی پیش کیا جس کی مثال تہذیبی تاریخ میں اس سے پہلے اور اس کے بعد نہیں ملتی۔ ہمارے لئے یہ بات انتہائی حیرت واستعجاب کا باعث ہے کہ قدسیوں کا جو گروہ محض ایک کلمہ کے سہارے دنیا کی نئی تاریخ رقم کرتا ہو آخر اسی گروہ کی بعد کی نسلوں میں یہ کیسے ممکن ہوا کہ اس کلمہ کی موجودگی کے

باوجود تاریخ پر اس کی گرفت کمزور پڑتی گئی۔ اگر کل جو کلمہ وجہ انقلاب تھا اور کل جس پیغام میں اتنی قوت تھی کہ وہ عام انسانوں کو قدسیوں کے گروہ میں تبدیل کر سکے تو آخر کیا بات ہے کہ اس کلمہ کی موجودگی کے باوجود اس کی تجلیوں کا ظہور بند ہوگیا ہے۔ اس مسئلہ پر ایک اور انداز سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر محمدؐ اللہ کے آخری رسول ہیں تو امت محمدیہ کو اب قیامت تک کے لئے تاریخ کو اپنی گرفت میں رکھنا ہے کہ امتِ مسلمہ کے بعد تاریخ کا سفر ختم ہوجاتا ہے۔ پھر آخر کیا بات ہے کہ تاریخ کے خاتمے سے پہلے امتِ مامور امتِ معزول میں تبدیل ہوچکی ہے۔ کیا ہم ایک مابعد تاریخ عہد میں سانس لے رہے ہیں، اور ہمارے اردگرد سرگرمیوں کا ظہور محض non-event سے عبارت ہے۔ آخری امت کی معزولی کے بعد تاریخ کی اس کے علاوہ کوئی اور توجیہہ نہیں کی جاسکتی۔

مسلم علماء و دانشور گذشتہ تین سو برسوں سے زوال امت پر گفتگو کرتے رہے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب تک ہم زوال کی ماہیت کا صحیح ادراک کرنے سے قاصر ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو شاید وہ ''اصحاب یقین'' ہیں جو اپنی تحریروں سے صرف امید افزاء مستقبل کی جوت جگانا چاہتے ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ مسئلہ کا حقیقت پسندانہ تجزیہ اور تلخ ادراک ہمارے اندر مزید مایوسی کا سبب ہوگا، اور اس کی کسی حد تک ذمہ داری ان احیائی مصلحین پر بھی ہے جو زوال کا گہرائی میں تجزیہ کرنے اور اس کا فلسفیانہ محاکمہ کرنے کے بجائے روایتی علاج کے نسخے کو اس زور و شور سے نشر کرتے رہے ہیں کہ کم از کم نسخۂ علاج دیکھ کر مرض کی سنگینی کا احساس نہیں ہوتا پھر ان خوش گمان شتر مرغوں کو بھی بَری نہیں ٹھہرایا جاسکتا جنہوں نے قصداً اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور جن کے یہاں آج بھی تاریخ پر اصحابِ باطن کی گرفت قائم ہے، اور جو شیرازۂ اسلامی کے منتشر ہوجانے کے باوجود اپنی خود ساختہ باطنی حکومت اور مفروضہ قطب، ابدال، اوتاد اور اولیاء کے نظامِ باطن میں آج بھی خوابوں کی ایک دنیا آباد کئے بیٹھے ہیں، اور جنہیں آج بھی انتظار ہے کہ شاید روحانیوں کی اس اسمبلی میں عنقریب امت کے حق میں کوئی فیصلہ صادر ہونے کو ہے۔

نفس مسئلہ کا ادراک

امت مسلمہ کا موجودہ زوال جو در اصل منصب سیادت سے اس کی معزولی سے عبارت ہے محض ایک ملی یا Pan-Islamic مسئلہ نہیں ہے بلکہ کارِ نبوت کے آخری حاملین کی حیثیت سے یہ ایک خالصتاً کائناتی مسئلہ ہے۔ جس سے اقوامِ عالم کا مستقبل وابستہ ہے۔ اگر کسی وجہ سے پیغامِ الٰہی کے آخری وارثین

دنیا کے منظر نامے سے ہٹ جائیں اور دوبارہ منصبِ سیادت پر ان کی واپسی کا کوئی امکان نہ ہو تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اب تاریخ اپنا سفر مکمل کر چکی ہے، انسانی زندگی اپنی معنویت کھو چکی ہے۔ مغرب کے بعض مفکرین گذشتہ سو سال سے تاریخ کے خاتمے کی پیش گوئی کرتے رہتے ہیں۔ Spengler کے مطابق موجودہ تہذیبِ مغرب جو سولہویں صدی سے ریاست اور کلیسا کے مابین پیدا ہونے والے بحران کی وجہ سے زوال سے دوچار ہے، ہر لمحہ اپنی موت کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ حالیہ دنوں میں مغرب کے بعض اہل فکر جمہوری کلچر کے فروغ اور اس کی بظاہر فتح سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اب تاریخ اپنی انتہائی ترقی یافتہ بلندیوں کو چھو رہی ہے۔ جس کے بعد شاید اب کرنے کو کچھ نہیں رہ جائے گا۔ یہ وہی post- historic عہد کا خطرہ ہے جس کی طرف ابھی ہم نے اشارہ کیا ہے اور جواب ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔

یہ خیال کہ تاریخ اپنی منطقی منزل تک پہونچنے سے پہلے ہی انتشار کا شکار ہوگئی ہے دراصل منصب نبوت کے غیر متوقع طور پر اچانک خالی ہوجانے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ یہ فکری خلاء اس لئے پیدا ہو رہا ہے کہ ہم نے اب تک تاریخ کو صرف تاریخ کی سطح پر سمجھنے کی کوشش کی ہے جب کہ ضرورت اس کو meta-historic یعنی اساطیر کی سطح پر سمجھنے کی ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ خود مسلمان علماء و مفکرین تاریخ کی اس تفہیم سے نابلد ہیں۔ امتِ مسلمہ کی وقتی معزولی سے جو خلاء پیدا ہوا ہے اس کے تاریخی اسباب کا صحیح صحیح پتہ لگانے اور منصب سیادت کی طرف دوبارہ مراجعت کا طریقہ دریافت کرنے میں ہم نے اب تک سست روی اور مایوسی کا اظہار کیا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ امتِ مسلمہ کی معزولی کے صحیح اسباب کا پتہ لگایا جائے، ان عوامل کی نشاندہی کی جائے جن کے نتیجے میں آخری نبی کی امت کتاب اللہ کی موجودگی کے باوجود انتشار وانحراف کا شکار ہوگئی ہے۔ یہ بھی دیکھا جانا چاہیے کہ یہ حادثہ کب اور کہاں پیش آیا۔ تاریخ کے کس مرحلے میں کس چھوٹی سی لغزش نے بڑے انحراف کا راستہ ہموار کردیا اور یہ تبدیلی دبے پاؤں کچھ اس طرح آئی کہ ہمارے اہل فکر اس کے ادراک سے قاصر رہے۔

ہمارے خیال میں مسئلہ کا نہ سمجھنا اور اس کا صحیح ادراک نہ ہونا اس مصیبت سے کہیں بڑی مصیبت ہے جس سے یہ امت گذشتہ صدیوں میں دو چار رہی ہے۔ جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ اصل مسئلہ ہے کیا اس کے حل کے لئے اقدامات کا سوچنا ایک نئی خودکشی کو دعوت دینا ہوگا۔ لیکن افسوس کہ ہم میں ایسے سرگرم نفوس کی کمی نہیں جو ان اہم سوالوں کا جواب معلوم کئے بغیر زوال کے عمل کو روکنے میں شب و روز سرگرم

ہیں یہی حضرات بالعموم اعداد و شمار کی روشنی میں مختلف میدانوں میں امت کا میزانیہ ترتیب دیتے ہیں۔ empirical طریقۂ research نے ہمیں صرف سطح پر نظر آنے والے مسائل سے آگہی دی ہے اور ہم اس بات کے خوگر ہوگئے ہیں کہ چیزوں کو جیسی کہ وہ نظر آتی ہیں اسی شکل میں دیکھیں نہ یہ کہ جیسی کہ وہ ہیں۔

زوال کے مسئلہ پر ہمارے دانشوروں نے اب تک جو کچھ غور وفکر کیا ہے یقیناً اس میں بہت سی مفید باتیں موجود ہیں جو ہمارے لئے نفس مسئلہ کے ادراک میں معاون ہوسکتی ہیں۔ البتہ اس مسئلہ پر متقدمین کے خیالات اور ان کے طریقہ تحقیق و تدبر سے اوپر اٹھ کر سوچنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم بالکل کھلے دل و دماغ کے ساتھ مسئلہ کو نئے انداز سے دیکھ سکیں اور ہمارے لئے متقدمین کی تشخیص سے الگ ہوکر نئی تشخیص تک پہنچنے کی راہ ہموار ہو۔ ہمیں یہ بات مان کر چلنا ہوگا کہ اس سوال پر متقدمین کے جوابات اپنی تمام تر صحت کے باوجود شافی اور conclusive نہیں ہیں۔ اگر کوئی جواب نظری اعتبار سے صحیح تر ہونے کے باوجود عملی methodology کی وجہ سے ناقابل عمل ہے تو اسے بھی جواب کی خامی پر ہی محمول کیا جائے گا کہ ہر کامیاب جواب اپنے ساتھ مستقبل کی methodology بھی لاتا ہے۔ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ بالکل ابتداء سے ہی ہمارا رویہ عملی جواب کی جستجو کا ہونا چاہیے۔ ورنہ اگر ہماری مساعی فکر و خیال کی سطح پر محض ایک علمی مشغلہ بن کر رہ جائے تو یہ کوئی مفید عمل نہیں ہے۔ جب تک کہ ہم اپنی تاریخ کے سلسلے میں ایک غیر جانب دارانہ اور غیر معتقدانہ رویہ پیدا نہ کریں، ہمارے لئے اپنی تاریخ کی بھیانک غلطیوں کا ادراک ممکن نہ ہوگا۔ اور جب تک ہم متقدمین کی تاریخ شناسی، عملی اور علمی زندگی میں ان کی دانش اور تفقہ کے سلسلے میں معتقدانہ رویہ ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوں گے، اسباب زوال کو سمجھنے کی ہماری تمام تر کوشش احمقوں کی نئی جنت آباد کرنے کے مترادف ہوگا۔

ہمارے لئے صرف زوال کے اسباب دریافت کرنا ہی کافی نہیں بلکہ ہمیں یہ بھی بتانا ہوگا کہ فی زمانہ ہمارے پاس عہد رسول کو recreate کرنے کی methodology کیا ہوگی اور اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہوگئے تو اسے اپنے متقدمین کے مقابلے میں زوال وانحراف کے سابقہ تجربات سے کیسے بچا سکیں گے۔ بلکہ اگر ممکن ہوسکے تو متاخرین کی غلطیوں سے بھی ہمیں اپنا دامن بچانا ہوگا۔ بالفاظ دیگر ہمیں اپنے تجدیدی عمل سے متاخرین کے فکری انحراف کا راستہ روک دینا ہوگا۔ اور یہ اس وقت ممکن ہے جب ہم موجودہ تحریر کو متقدمین کے کارتجدید کا محض ایک توصیہ بنانے سے گریز کریں۔ ایک ایسے وژن کا recreate کرنا اس وقت ممکن ہے جب ہم متقدمین اور متاخرین دونوں کو زمان ومکان کی قیود سے بلند تر ہوکر دیکھ

سکیں۔ تخیلاتی طور پر ہمارا تاریخی شعور نہ صرف یہ کہ ماضی کو مجسم ہوکر دیکھ سکے بلکہ مستقبل بھی اپنی تمام تر تفصیلات، جزئیات اور ابعاد کے ساتھ ہماری نگاہوں کے سامنے ہو۔ کسی ایسے vision (وژن) کے بغیر عہدِ رسولؐ میں واپسی کا نعرہ محض مسخ شدہ تاریخ میں گمشدہ اسلامی ورثے کی تلاش بن کر رہ جائے گی۔ رسولؐ کے عہد میں واپسی کا انداز زمانی اور مکانی سطح پر نہیں بلکہ مجسم ماحولیاتی سطح پر ہونا چاہیے۔ ہمارا مطالعۂ قرآنی جب تک ہمیں نزول قرآن کے ماحول اور خود قرآن کے اندر موجود عمرانیات اور آثار واحادیث رسولؐ کی تفصیلات کی بنیاد پر اس ماحول کو دوبارہ اسی طرح اپنے دل و دماغ پر مترشح نہیں کرتا، گویا ہم خود کو ذہنی اور قلبی طور پر نزول قرآن کے عہد میں پاتے ہوں، تب تک نہ تو اس زوال کا حقیقی ادراک ممکن ہے— جس سے آج ہم دوچار ہیں— اور نہ ہی رجوع الی منصب النبوۃ کی کوئی شکل پیدا ہوسکتی ہے۔

چودہ صدیاں بیت جانے کے بعد بھی ہم اب تک اس سوال کا کوئی شافی جواب تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں کہ آیا تاریخ کسی معلوم خدائی منصوبے کے تحت آگے بڑھ رہی ہے اور یہ کہ کیا امت مسلمہ کی منصب امامت سے معزولی خدا کے اسی طے شدہ منصوبے کا حصہ ہے۔ یا یہ سب کچھ صرف اس لئے ہوگیا ہے کہ بعض فکری التباسات، نظری مغالطے اور عملی حادثات کی وجہ سے تاریخ ہماری مٹھی سے نکل گئی ہے۔ اس سوال کے حتمی جواب کے بغیر ماضی کی دریافت اور مستقبل کی بازیافت کی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی۔

تاریخ کے سلسلے میں ہمارے جدید دانش وروں کا رویہ بڑی حد تک تاریخ کی اس تفہیم پر منحصر ہے جس کی پرورش و پرداخت گذشتہ تین سو سالوں میں مغرب میں ہوئی ہے۔ شاید ایسا اس لئے بھی کہ زوال کی صدیوں میں ہم نے تاریخ کو اسباب زوال کی methodology کے طور پر برتنے کی کوشش کم ہی کی ہے۔ ہمارے یہاں تاریخی شعور کا سب سے بڑا سنگ میل اب بھی ابن خلدون ہے۔ جس کے تاریخی شعور ''عصبیۃ'' نے ہماری ملی زندگی کے احیاء کے سلسلے میں ایک عملی مایوسی کی فضا عام کردی ہے۔

تاریخ مقصد ومعنویت سے خالی نہیں، ہماری تفہیم کے مطابق رسول اکرمؐ کی بعثت کے بعد انسانی تاریخ آخری رسولؐ کی امت سے عبارت ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ میں جو کچھ بھی ہے وہ خود اس کے اندر کا بگاڑ ہے جس کی درستگی کا فریضہ ہمارے اوپر عائد ہوتا ہے۔ ہم آج جس عہد میں سانس لے رہے ہیں وہ دراصل تاریخ کے داخلی بحران کا ایک عہد ہے جس کی درستگی کے بعد اسے اسی سمت میں آگے بڑھنا ہے جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے استخلاف فی الارض کی شکل میں کیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ بعثت نبویؐ کے بعد

تاریخ کا pre-ordained الٰہی فریضہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں، کہ وہ ہر لمحہ نور توحید کے اتمام کی طرف اپنا سفر جاری رکھے اور مدینے کی (micro society) مائیکروسوسائٹی کو macro انداز سے برتنا ممکن ہو سکے۔ یہی ہے اسلام کا وہ un-finished ایجنڈا جس کی ابتداء تو مکہ میں آپؐ کے ہاتھوں ہوئی البتہ اسے منطقی اتمام تک پہنچانے کی ذمہ داری پوری امت کے کاندھوں پر ڈال دی گئی ہے۔

اس کے علاوہ تاریخ کا اگر کوئی اور بھی مقصد ہے یا اس کا کسی متعینہ راستے پر آگے بڑھنا طے کر دیا گیا ہے تو اس قسم کی باتیں ہمارے لئے اجنبی ہیں اس کے لئے نہ تو کوئی عقلی سند ہے اور نہ ہی اس قسم کی تاریخی myth کو ہمیں کوئی وقعت دینی چاہئے۔ یہ خیال کہ تاریخ ایک جبری منطقی انجام کی طرف آگے بڑھ رہی ہے، دراصل اہل مغرب نے اپنے status quo کو برقرار رکھنے کے لئے تراشا ہے۔ مغرب میں اس مفروضے کو سب سے مدلل اور منظّم انداز سے مارکس نے پیش کیا۔ جس نے اسے کسی قدر خام حالت میں ہیگل سے لیا، ہیگل نے جان اسٹریٹ مل سے اور اس نے کومے سے یہ خیال مستعار لیا۔ کہا جاتا ہے کہ تاریخ کی ایسی liniar تعبیر کے قائل Plato بھی تھے بلکہ اس سے بھی پہلے Heraditus اور Hesoid اسی انداز سے سوچتے تھے۔ لیکن ہمارے خیال میں تاریخ کی معنویت اور طے شدہ متعین راستوں پر چلنے والی بات دراصل یہودی اثرات کے ذریعہ پیدا ہوئی۔ یہودیوں کا اپنے بارے میں منتخب اور برگزیدہ قوم کا خیال ہونا فی نفسہ ایک تاریخی معنویت کا حامل ہے۔ یہودیوں کے مطابق تاریخ ایک مفصل پلان ہے جس کا خالق Yahweh ہے۔ اس منصوبے سے انبیاء کسی حد تک ہی آگاہی لیتے ہیں، بقیہ حصہ پیش بینوں اور قیافہ شناسوں کے سپرد ہے۔ تاریخ کی اس تعبیر کے مطابق پیش بینوں کی اس لئے بھی اہمیت ہے کہ اگر ہمیں مستقبل کے حالات کی تھوڑی بھی آگاہی ہو جائے تو ہم خود کو اس کے لئے ڈھالنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اور اس طرح مستقبل کی تاریخ میں کہیں زیادہ موثر رول ادا کر سکتے ہیں۔

دیکھا جائے تو مارکس کا جدلیاتی مادیت کا خدا، Yahweh سے بڑی حد تک مشابہ ہے۔ خود مارکس کا کام قیافہ شناسی کا ہے جو پیش آمدہ مستقبل سے بہتر انداز سے فائدہ اٹھانے کے لئے پرولتاریوں کو خبردار کر رہا ہے۔ ورنہ جبری تاریخ میں کسی انقلابی کے لئے جواز ہی کب ہے۔ مارکس کی اس تاریخ شناسی کو مسلم حلقوں میں اصولی طور پر خواہ قبول کیا گیا ہو یا نہیں، البتہ اس کی بازگشت مسلم علماء کی ان تحریروں میں ملتی ہے جو جبری فلسفے کے تسلسل میں لکھی گئی ہیں۔ البتہ ان پر نئی سائنسی مارکسی تعبیر نے ایقان کا رنگ غالب کر دیا ہے۔ اس قسم کی تفہیم کے عام ہونے میں ان غیر مارکسی مغربی دانشوروں کی تحریروں کا بھی دخل ہے

جسے علم کے حتمی ماخذ کی حیثیت سے مسلم مفکرین نے فیض واکتساب کے لئے رجوع کرنے میں سند کا درجہ دے رکھا ہے۔ اس میں ٹوائین بی کی *The Study of History* خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جسے عام طور پر تاریخ کی کتاب سمجھا جاتا ہے، حالانکہ اس سے گمراہ کن اور غیر سائنسی مطالعۂ تاریخ کی مثال اس سے پہلے کم ہی ملتی ہے۔ اسپنگلر ہوں یا ٹوائین بی ان کے یہاں ایک pattern کی دریافت کی کوشش تو یقیناً ہے لیکن جہاں چھ ہزار سال کی تاریخ میں صرف بیس اکیس تہذیبوں کو مطالعے کے لئے منتخب کیا گیا ہو وہاں ان تہذیبوں کے انتخاب کا مقصد کسی pre-conceived pattern کو سند اور جواز فراہم کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ ہاں ان کوششوں سے یہ ضرور ہوا کہ مشرق کی مغلوب تہذیب کو یہ یقین سا آنے لگا کہ تاریخ اپنے جس متعینہ راستے پر آگے بڑھ رہی ہے، اس میں ان کا رول اب کلیدی اور مرکزی نہیں رہ گیا ہے۔ حالانکہ ٹوائین بی کے دریافت شدہ قانون چیلنج اور ریسپانس (challenge and response) کے نتیجے میں خوابیدہ مسلم فکر میں مثبت انقلاب آنا چاہئے تھا۔ لیکن جس قوم کا انبیائی ایجنڈا نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہو وہ اس عظیم چیلنج کو اسی وقت قبول کرسکتی تھی جب اس کی دریافت ممکن ہوسکے۔ جب تک چیلنج نگاہوں میں مستحضر نہ ہو اس کا جواب کیسے دیا جاسکتا ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تاریخ محض اتفاقات اور حادثات کے نتیجے میں بنتی ہے۔ امیر علی کے مطابق اگر مسلمانوں کی فوج فرانس کے دروازوں پر روک نہ دی جاتی تو آج ہماری تاریخ مختلف ہوئی۔ یقیناً تاریخ کو فیصلہ کن موڑ دینے میں بسا اوقات چھوٹے چھوٹے عوامل فیصلہ کن رول ادا کرتے ہیں۔ لیکن ان کا رول فیصلہ کن اسی وقت ہوتا ہے جب پہلے سے بڑے عوامل تاریخ کو ان متعینہ راستوں پر ہانکے لئے چل رہے ہوتے ہیں۔ رسل[۲] کا یہ کہنا کہ اگر کمیونسٹ انقلاب کو لینن نہ ملا ہوتا تو روسی انقلاب کی تاریخ مختلف ہوتی یا Prussians کو Valmy کی جنگ میں کوئی بہتر جرنل ہاتھ آ گیا ہوتا تو وہ انقلاب فرانس کا خاتمہ کرسکتے تھے۔ یا یہ کہ Henry VIII اگر Anne Bolin کی محبت میں گرفتار نہ ہوتا تو آج امریکہ کا وجود نہ ہوتا، دراصل اسی قسم کی بات ہے جس طرح ہمارے یہاں سُنّیوں کے بعض حلقے شیخین کے غلو میں یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ اگر ابوبکرؓ و عمرؓ نہ ملے ہوتے تو اسلام کی یہ عظیم الشان تاریخ نہ ہوتی۔ حالانکہ اصولی طور پر کسی انقلاب کا برپا ہونا اس کے پیش آمدہ لوازمات کا حصہ ہوتا ہے۔ جو کچھ آگے آتا ہے یا جیسے لوگ اس انقلاب کو ملتے ہیں دراصل اسی انقلاب کا منطقی لازمہ ہوتے ہیں۔ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔[۳]

ہمارے مؤرخین نے عہد زوال کا محققانہ تجزیہ کرنے اور ہماری بھیانک لغزشوں اور تاریخی غلطیوں سے پردہ اٹھانے کے بجائے اس کی تمام تر ذمہ داری سازشیوں کے بعض گروہ پر ڈال دی ہے۔ لہٰذا عہد عثمانی سے لے کر زوال بغداد تک ہماری تاریخ کے صفحات یہودی، سبائی اور ایرانی سازشیوں کے تذکروں سے پر ہیں۔ اس قسم کی تاریخ فہمی سے اپنی غلطیوں کی نشاندہی ناممکن ہوجاتی ہے۔ سازشی گروہ اپنی حیاتی تصویر (life-size) سے کہیں زیادہ بڑا نظر آتا ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے گویا بالکل ابتدائی دنوں سے ہی تاریخ ہماری مٹھی سے پھسل چکی تھی۔ عبداللہ بن سبا کی larger-than-life-size تصویر اس قبیل کی ایک دلچسپ مثال ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سازشیں جنہیں اگر اسی قدر بڑی تسلیم بھی کرلیا جائے، اگر نہ ہوتیں تو اسلامی تاریخ کا رخ کچھ مختلف ہوتا، اس بات کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ یہ ہمارے اندرون کی خامی تھی جو سازشوں کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ ورنہ ہمارا فکری اور ملی ڈھانچہ اصل مدنی ماڈل کے مقابلے میں کمزور نہ پڑتا، تو کسی بھی سازش کا فوری قلع قمع کیا جاسکتا تھا۔ اگر ہم واقعی زوال کی ماہیت سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں اس قسم کے مفروضات کو خیر باد کہنا ہوگا، کہ ہمارے خلاف ہمارے اردگرد جو کچھ بھی ہورہا ہے وہ محض سازشوں کا ظہور ہے۔ بات یہ ہے کہ جن لوگوں کو اپنے اندرون کی خامی تلاش کرنا گراں گزرتا ہے یا جنہیں اس بات پر اصرار ہوتا ہے کہ ہمارے متقدمین کا فکری ڈھانچہ اور ان کی علمی کاوشیں آج بھی اس سرزمین کو الٰہی انقلاب سے دوچار کرنے کے لئے کافی ہیں، اس پر مزید کسی غوروفکر کے اضافے کی ضرورت نہیں، ان کے لئے اپنی ناکامی کی تمام ذمہ داری سازشیوں پر ڈال دینا آسان ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو اس بات پر اصرار ہو کہ ان کے پاس آج بھی جنت بنانے کا فارمولہ موجود ہے وہ غیاب جنت کے لئے اس کے علاوہ اور کیا دلیل پیش کرسکتے ہیں کہ ان کی اسکیم شیطان کی سازش کی نذر ہوگئی ہے۔ جس طرح قدیم روما میں ٹروجن وار (Trojen war) دیوتاؤں کی سازش کا نتیجہ سمجھے جاتے تھے اسی طرح آج مسلمانوں نے اپنی تمام تر ناکامیوں اور محرومیوں کا الزام یہودیوں کے سر تھوپ رکھا ہے۔ اس قسم کی سازشی theories بھی دراصل ایک بڑی سازش کا حصہ ہیں۔ جو بڑی حد تک ہماری اپنی پیدا کردہ ہے دوسروں کی نہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم تاریخ کو تاریخی سطح سے کہیں بلند ہوکر مابعدالتاریخ (meta hisotric) کی سطح پر سمجھنے کی کوشش کریں۔ قرآن نے اسے اساطیر سے تعبیر کیا ہے۔ عاد وثمود کے واقعات myth بھی ہیں اور تاریخ بھی۔ تاریخ اس لئے کہ یہ واقعات عملی دنیا میں ظہور پذیر ہوئے ہیں اور myth اس لئے کہ

ان کا تمام تر جزئی تفصیلات کے ساتھ خیال یا عمل کی سطح پر re-create کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں۔ ہم تاریخ کی اپنی تفہیم اور فریضۂ تاریخ کے مراحل میں ان اساطیر سے یہ سبق لے سکتے ہیں کہ جس طرح راہِ ہدایت سے دوری نے عاد وثمود کے ہاتھوں سے تاریخ کی لگام کھینچ لی تھی یا جس طرح اپنی پے در پے غلطیوں کے باعث اہل یہود منصب سیادت سے معزول کردئے گئے تھے اسی طرح اس قسم کی غلطیاں امت مسلمہ کو بھی امت مامور سے امت معزول میں تبدیل کرسکتی ہیں۔

تاریخ کے بارے میں یہ تصور کہ وہ اپنے بندھے ٹکے راستے پر گامزن ہے جو دراصل خدائی فیصلہ ہے، بڑی حد تک اس جبریہ رجحان کی پیداوار ہے جسے بوجوہ بالکل ابتدائی عہد میں ہی مسلم فکر میں داخلہ مل گیا تھا۔ اموی اور عباسی حکمرانوں کے لئے اس خیال میں زندگی کا سامان تھا، وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہماری منحرف حکومتیں خدائی فیصلے کی حیثیت سے لوگوں کے لئے قابل قبول ہوجائیں تو مخالفین کو قابو میں رکھنا اور خاموش اکثریت کو مطمئن کرنا آسان ہوجائے گا۔ اس خیال نے آگے چل کر ''السلطان ظل اللہ'' کے لئے راستہ ہموار کیا۔ حکومت بنو امیہ کے سیاسی انحراف پر پردہ ڈالنے کے لئے ایسی وضعی روایتیں سامنے لائی گئیں جن میں سمندر پر جہاد کرنے والوں کے لئے بشارت دی گئی تھی اور جن کے مطابق بنو امیہ کا برسر اقتدار آنا گویا انہیں سلطنت اسلامی کی توسیع کے لئے استعمال کرنے کی ایک خدائی اسکیم تھی۔ لہٰذا ان پیش بینیوں کی موجودگی میں لوگوں کے لئے حکومت کے اس منحرف قالب کو قبول کرنا نسبتاً آسان ہوگیا۔ جب یہ بات اصولی طور پر مان لی گئی کہ اموی حکمراں اور اس کے بعد بڑی حد تک عباسیوں کی حکومت خدائی مشن کی تکمیل کے لئے وجود میں لائی گئی ہے، جو رسولؐ اللہ کی پیشین گوئیوں کے مطابق تاریخ کو ظہور میں لا رہی ہے، تو پھر اصلاح احوال کے لئے کسی کوشش کا کوئی اخلاقی جواز تھا اور نہ ہی مسلح جدوجہد کے لئے کوئی نظری بنیاد فراہم ہوتی تھی۔ تاریخ کے اس جبری فلسفے کی حمایت میں وضعی اقوال رسولؐ کے ڈھیر لگا دئے گئے۔ آگے چل کر اس رویے نے صوفیاء کے لئے خانقاہوں کا جواز پیدا کیا اور امت میں یہ عام ذہن بن گیا کہ تاریخ جس راستے پر جارہی ہے اسے چھیڑا نہ جائے، کہ یہ سب دراصل خدائی فیصلہ ہے[۴]۔

جب یہ عقیدہ دل و دماغ میں سرایت کرجائے کہ تاریخ کا سفر پہلے سے طے شدہ ہے۔ فیصلے کی سیاہی خشک ہوچکی ہے تو پھر اصلاح احوال کی کوئی کوشش شروع ہونے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہے۔ پھر کرنے والے کے لئے جو کارِ لا یعنی تفویض ہوتا ہے اس میں وہ اپنا رول اس کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھتا کہ وہ اپنی دانست بھر نیکی کے عمل میں لگا رہے، اس اطمینان قلب کے ساتھ کہ اس کی یہ تمام کوشش صورت

حال پر اثر انداز نہیں ہوسکتی۔ دیکھا جائے تو اس نوع کی تمام ضعیف احادیث جو مستند اور غیر مستند کتابوں میں راہ پا گئی ہیں ان کا ہمارے دل و دماغ کو shape دینے میں کلیدی رول ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ نظام اسلامی کے انحراف کو جو لوگ واضح طور پر محسوس کرتے تھے اور جنہوں نے اس کی اصلاح کے لئے اپنی تمام تر قوت جھونک دینے کا تہیہ کرلیا، اور جنہوں نے جابر حکمرانوں کے خلاف خروج کرنا اپنا عین دینی فریضہ سمجھا، وہ بھی اگر اپنے حق میں عوامی حمایت فراہم نہ کرسکے تو اس کی بھی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ امت میں ایک عمومی انداز فکر پیدا ہوچلا تھا کہ جمل اور صفین کی جنگ کے بعد بھی جب اصلاح احوال کی کوشش کامیاب نہیں ہوسکی، حسین ابن علیؓ اور زین العابدینؒ کی قربانیاں بھی جب نظام کو اصل منہج نبوت کی طرف واپس نہ لے جاسکیں تو بھلا ہما شما لوگ اب کوئی قابل ذکر تبدیلی کیسے لاسکتے ہیں۔ یہ سب جو کچھ بھی ہے خدائی فیصلہ ہے جسے ہمیں قبول کرلینا چاہیے اور اپنے اپنے دائروں میں اپنی استطاعت بھر اصلاح احوال کی ذاتی کوشش کو محدود رکھنا چاہئے۔ رہے وہ لوگ جو اب بھی نظام کی اصلاح کی باتیں کرتے ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ انسانی کوشش نظام حکومت کو دوبارہ منہاج النبوۃ پر قائم کرسکتی ہے تو یہ دراصل تاریخ کے خلاف جنگ کررہے ہیں، جو گویا خدائی فیصلے کے خلاف جنگ کے مترادف ہے۔ ایسے لوگ جو تاریخ کی اس تفہیم میں یقین رکھیں ان کو مطعون کرنے کے لئے ان روایات کا سہارا لیا گیا۔ مثلاً "**القدریة مجوس هذه الامة**[۵]" عوام الناس کو ان اصحاب سے دور رکھنے کے لئے یہ حدیثیں بھی سامنے لائی گئیں کہ "**لاتجالسوا اهل القدر و لا تفاتحوهم**[۶]".

ایک ایسے مرحلے میں جب دوسری نسل کے مسلمانوں کو صاف محسوس ہوتا تھا کہ تاریخ ان کی مٹھی سے پھسلنے لگی ہے اور جب وہ واضح طور پر یہ دیکھ رہے تھے کہ بعثت نبوی سے قیامت تک کے لئے جس امت کو منصب سیادت پر فائز کیا گیا ہے اب وہ نظری التباس کا شکار ہورہی ہے۔ اُس وقت اگر اصلاح احوال کی کوششوں کو فوری طور پر وسیع حمایت نہ مل سکی تو اس کی وجہ کچھ تو سابق مصلحین کی ناکامی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے فتنے تھے۔ جمل اور صفین کا زخم ابھی تک رِس رہا تھا، حسینؓ کی شہادت کا واقعہ بالکل تازہ تازہ تھا۔ اس لئے لوگوں میں ان خیالات نے اپنی جڑیں مضبوط کرلیں کہ اب اصلاح احوال کی کوئی کوشش بہت زیادہ سودمند عمل نہیں ہے۔ بخاری اور مسلم میں ایک حدیث اس طرح بیان ہوئی ہے کہ ابن آدم کے لئے اللہ نے یہ پہلے سے طے کررکھا ہے کہ اس سے کس قدر زنا سرزد ہوگا[۷]۔ اس قبیل کی احادیث کی کمی نہیں جس میں یہ بات تفصیل سے بتائی گئی ہے کہ اللہ نے ہر نفس کی پیدائش کے وقت ہی

اس کے لئے یہ مقدر کر دیا ہے کہ وہ جنت میں جائے گا یا جہنم میں۔ ان روایتوں نے جو اس وقت مسلم دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھیں ہمارے اہل دانش کو ایک عمومی قنوطیت اور غیر حرکتیت میں مبتلا کر دیا۔ حالانکہ انہی کتابوں میں اس قبیل کی احادیث کی بھی کمی نہیں تھی جس میں اصلاح احوال کو بھی خدائی اسکیم کا ہی حصہ بتایا گیا تھا۔ لیکن جب فیصلے کی روشنائی کا خشک ہونا ذہنوں پر مسلط ہو جائے تو چھوٹی چھوٹی انسانی کوشش اس بڑی اسکیم میں اپنی معنویت کھو دیتی ہے۔ ترمذی نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ ایک صحابی نے جب آپؐ سے یہ پوچھا کہ ہم بیماریوں سے بچنے کے لئے جو احتیاطی تدابیر یا دوائیں استعمال کرتے ہیں وہ خدائی فیصلے میں مداخلت تو نہیں؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں، بلکہ ایسا کرنا خود خدائی فیصلے کا حصہ ہے[۸] کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں جب طاعون پھیلا اور آپ نے مسلم فوج کو اس جگہ سے کوچ کرنے کا حکم دیا، تو اس پر کسی شخص نے یہ اعتراض کیا کہ کیا ہم خدائی فیصلے سے بھاگنا چاہتے ہیں: 'افراراً من قدر الله'؟ عمرؓ کا جواب تھا: یقیناً ہم خدائی فیصلے سے خدائی فیصلے کی طرف بھاگ رہے ہیں: 'نعم من قدر الله إلى قدر الله'. بظاہر عمرؓ کا یہ قدم ایک اعتدال اور synthesis کا علامیہ ہے جس نے آگے چل کر اس مسئلے پر اہلِ سنت والجماعت کے عقائد کو ترتیب دینے میں مدد دی۔ البتہ مسئلے کی یہ تفہیم بھی ہمارے دل و دماغ سے اس کیفیت کو محو کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے جس کے مطابق تاریخ کا راستہ طے ہے اور فیصلے کی روشنائی خشک۔

کتب احادیث میں فتنہ کے بارے میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان پر بھی وسیع سماجی اور تاریخی پس منظر میں از سر نو غور و فکر کی ضرورت ہے۔ فتنہ ایک ایسی صورت حال کا بیان ہے جب اجتماعی امور پر باہمی نزاع civil war کی شکل اختیار کر لے، افہام و تفہیم کی صورت حال ناکام ہو جائے، جھوٹی افواہوں اور مصدقہ خبروں میں تمیز مشکل ہو جائے، اور بسا اوقات یہ محسوس ہونے لگے کہ معاشرے کی سمت کھوئی گئی ہے۔ ایسی صورت حال میں عقل اور دین کا تقاضہ تو یہی ہے کہ کتاب وسنت سے روشنی طلب کی جائے اور پھر اپنی سی تمام ترکیبیں اور تمام قوت اصلاح احوال کے لئے جھونک دی جائیں۔ البتہ جب ذہنوں پر یہ خیال حاوی ہو کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ پہلے سے طے شدہ ہے تو پھر افراد کے لئے اس چیلنج سے کنارہ کشی اور ایام فتنہ میں صرف اپنی ذاتی نجات کی فکر کی گنجائش نکل آتی ہے۔ یہ بات قطعیت کے ساتھ کہنا مشکل ہے کہ اسلام میں صوفیاء کے باقاعدہ ظہور سے پہلے ترکِ دنیا کو باضابطہ معتبر دینی رویے کی حیثیت سے سب سے پہلے کس نے متعارف کرایا۔ البتہ آج کے pacifist ترکِ دنیا کے لئے اور امتِ مسلمہ کی ذمہ داریوں سے اپنا دامن بچانے کے لئے ان احادیث کا سہارا لیتے ہیں جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے اور

جس میں ایام فتنہ میں بیٹھنے والے شخص کو کھڑے ہونے والے پر فوقیت دی گئی ہے، کھڑے ہونے والا چلنے والے سے بہتر بتایا گیا ہے اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر[9] پھر اس قبیل کی حدیثیں بھی موجود ہیں جس میں اجتماعی مسائل سے دور رہنے اور سماجی ذمہ داریوں سے کنارہ کشی کی باضابطہ ترغیب ہے۔ حضرت ابوذرؓ سے ایک حدیث منقول ہے جس کے مطابق آپؐ نے فرمایا: اے ابوذر! امارت ایک بڑی ذمہ داری ہے، جس کا نتیجہ یوم آخرت میں ندامت اور رسوائی کی شکل میں ہوگا الا یہ کہ اس عہدے کو صحیح طریقے سے حاصل کیا گیا ہو اور اس کا واقعی حق ادا کر دیا گیا ہو۔ جن لوگوں نے اس قسم کی حدیثوں کی بنیاد پر pacifist رویے کی بنا ڈالی، انھوں نے کہیں تو تشریح میں اور کہیں متن میں اس خیال کا اظہار بھی کر دیا کہ منصب کا حق ادا کرنا چونکہ عملی طور پر ممکن نہیں اس لئے سماجی نوعیت کی ذمہ داریاں قبول کرنے والے یقیناً روز قیامت رسوائی کا سامنا کریں گے۔ محمد الشیبانی کہتے ہیں رسول اللہ نے ابوذر سے استفہامیہ انداز سے یہ بھی کہا کہ اے ابوذر! کیا کسی شخص کے لئے ان جاری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ممکن ہے؟[10] یہ دو رجحانات آگے چل کر اسلامی Pacifism کی بنیاد بن گئے۔ اولاً تاریخ خدائی اسکیم کے مطابق آگے بڑھ رہی ہے جس پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔ ثانیاً اگر اصلاحِ احوال کے ذریعے سماجی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا پڑے تو اس سے بہ کمال عہدہ برآ ہونا ایک امر محال ہے اس لئے عام ذہن یہ بنتا گیا کہ اب اپنے ایمان کی سلامتی کا راستہ صرف یہ ہے کہ گھر بیٹھا جائے جو باتیں اچھی لگیں اس پر عمل کیا جائے اور جس بارے میں شبہ ہو اس پر کلام نہ کیا جائے۔ اپنے کام سے کام رکھا جائے اور اجتماعی ذمہ داریوں سے حتی الامکان پہلوکشی کی جائے۔ اس غیر عملی رویے کے لئے بھی احادیث کے ذخیرے میں بنیاد ڈھونڈ نکالی گئی[11]۔ آگے چل کر اسی pacifist رویے نے امت میں انفرادی دینداری کی ایک مکمل دینیات تیار کر دی۔ اہل ایمان کے لئے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ زندگی کے تمام چیلنجز کا مقابلہ کئے بغیر کامیاب آخرت کی توقع کر سکیں اور انھیں گھر بیٹھے انفرادی نجات کی ضمانت مل سکے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ اہل ایمان کی پہلی نسل فکری اور اجتماعی زندگی میں کسی انحراف کے سلسلے میں انتہائی حساس تھی۔ حضرت عثمان کا قتل جس کی حیثیت پہلے بڑے اجتماعی crisis کی ہے، اس بارے میں صحابۂ کرام کا رویہ ٹوٹتے ماڈل کو فی الفور اصل بنیادوں پر قائم کرنے کا تھا، جمل اور صفین کی جنگوں میں کبار صحابہ کرام کا حالات کی درستگی کے لئے میدان میں آ جانا گویا اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ مسلمان اپنے اجتماعی ماڈل کے سلسلے میں انتہائی حساس ہیں۔ اور وہ ہر قسم کے انحراف کو بہر صورت ختم کرنا چاہتے ہیں۔

ابوبکر صدیق کے عہد میں رِدّہ کی جنگ اس قبیل کا ایک کامیاب تجربہ تھی، جب ماڈل سے کسی عمداً انحراف کو گوارا کرنے یا حالات کو اس کے رخ پر چھوڑ دینے کے بجائے فی الفور اس انحراف کو درست کرنے کی کوشش کی گئی۔ البتہ آنے والی صدیوں میں جب نظام عدل کا انقلابی ماڈل انحراف کا شکار تھا اور مسلمانوں میں تاریخ کے سلسلے میں ایک عام بے اعتنائی اور مایوسی پیدا ہوچکی تھی، اس خیال کو تقویت ملتی گئی کہ جب اصلاح احوال کی کوششیں ابتدائی ایام میں کامیاب نہ ہوسکیں اور جب عملی مجبوریوں کے پیش نظر متقدمین نے منحرف نظام کو کسی قدر گوارا کرلیا تو ہماری انقلابی سعی بھلا کیسے کامیاب ہو پائے گی۔ پھر اہل فکر میں یہ رجحان بھی پرورش پارہا تھا کہ فتنے کے ایام میں جن لوگوں نے سرگرم رول انجام دیا اور جن لوگوں نے حالات سے تنگ آ کر خود کو گھروں میں محصور کرلیا ان میں سے کسی کو بھی ہم مطعون نہیں کرسکتے۔ اس طرح دونوں رویے یکسر مستند قرار پائے۔ پھر یہ کہ ایک ایسے ماحول میں جب سیاسی محرکات کی بنیاد پر بنوامیہ اور اصحاب علی اپنی اپنی حمایت میں فضائل اور حسنات کا انبار لگا رہے تھے اس وقت معتدل مسلمانوں اور جمہور امت کے لئے اعتدال کی راہ یہی ہوسکتی تھی کہ اصحاب رسول کے سلسلے میں احترام کو رواج دیں اور صحابہ کے مختلف ماڈل کو یکساں معتبر گردانیں۔ آگے چل کر اہل سنت والجماعت کے قیام میں اس معتدلانہ رویے نے ایک اہم رول انجام دیا۔ بلکہ صحابہ کرام کی نسل کو وسعت دے کر تابعین اور تبع تابعین کو بھی اس مثالی ماڈل میں شامل کرلیا گیا۔

رسول اکرمؐ کی زمانی قربت کی وجہ سے صحابۂ کرام کو جو خصوصی مقام حاصل ہے اس میں کسی کلام کی گنجائش نہیں، اسی طرح ان لوگوں کو بھی جنہوں نے صحابہ کرام سے کسب واستفادہ کیا یا جوان کے شاگردوں کی تربیت میں رہے، اسلام کی تاریخ میں ان کا مقام زمانی قربت اور ان کی خدمات کی وجہ سے محفوظ رہے گا۔ البتہ ابتدائی عہد میں اسلامی فکر جس راستے پر آگے بڑھتا رہا اس میں ایک انتہائی اہم نکتہ یہ تھا کہ رسولؐ کے بعد نظام عدل کی کمان اب عام انسانی ہاتھوں میں آنے والی تھی۔ پہلی نسل ﴿**محمد رسول الله والذين معه**﴾ کی وجہ سے ایک خاص امتیاز کی حامل تھی۔ البتہ بعد کی نسلیں اس اعزاز سے خالی تھیں، جنہیں رسولؐ اور ان کے صحابہ کی نیابت میں ماڈل کو برتنے کا چیلنج قبول کرنا تھا۔ یہ فطری بات تھی کہ جب قیادت مہبط وحی سے عام انسانوں کی طرف منتقل ہورہی ہو تو ماڈل میں کسی قدر شکست و ریخت اور dilution کا عمل فطری تھا۔ آنے والی نسلیں اگر قرن اول کی مسلم تاریخ کو اس حیثیت سے دیکھتیں اور تاریخ کے اس انوکھے تجربے کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتیں تو ان کے لئے ابتدائی خانہ جنگیوں اور فکری اور اجتماعی انحراف

کا ادراک کرنا آسان ہوتا، اور پھر یہ مایوسی بھی پیدا نہ ہوتی جس کا اظہار اکثر مورخین کرتے ہیں کہ جو نظام تیس سال سے زیادہ نہ چلا بھلا اب اسے دوبارہ انہی خطوط پر کیسے قائم کیا جاسکتا ہے۔ بدقسمتی سے اس کے برعکس ہوا یہ کہ بعد کی نسلوں نے اس انحراف کو درست کرنے کے بجائے اسے ایک طرح کا اعتبار اور تقدس دینے کی کوشش کی۔ ابتدا میں تو یہ سب ضرورت کا حصہ تھا کہ ابتدائی ایام کے خروج اور خانہ جنگیوں نے چونکہ حالات کو درست کرنے کے بجائے محض امت کو زخموں سے دوچار کیا تھا اس لئے یہ عمومی رویہ بنتا گیا کہ سیاسی نظام سے چھیڑ چھاڑ نہ کیا جائے۔ اس انحراف کو گوارہ کرلیا جائے تاکہ اسلامی فتوحات کا سلسلہ جاری رہے ہماری قوتیں آپس میں نہ الجھیں اور ہم اس انحراف کے تدارک کے لئے اپنے اپنے دائرے میں انفرادی اور علمی سطح پر کوششیں جاری رکھیں۔ رفتہ رفتہ اس رویے نے جمہور مسلمانوں کے لئے ایک عقیدے کی حیثیت اختیار کرلی، ان کا یہ عمل خود ان کے لئے سند بن گیا اور بعد کی نسلوں کے لئے صلحائے سلف کا چھوڑا ہوا قدوہ۔

اسلام کی ابتدائی صدیوں کو مستند ماخذ کی حیثیت سے پیش کرنے میں اس خیال کو بھی دخل ہے کہ ہمارے متقدمین نے دین کو جس طرح سمجھا ہے وہی کچھ معتبر اور مستند ہے۔ شاید ایسا سمجھنے میں بعض احادیث کی اس فہم کا بھی حصہ ہے جس کے مطابق رسول اکرمؐ کا فرمان ہے کہ ہماری نسل یا ہمارا عہد بہترین عہد ہے اور پھر اس کے بعد وہ لوگ جو ہمارے بعد اور پھر ان کے بعد آنے والے لوگ[۱۲]۔ یہ حدیث بالعموم علماء ومشائخ کی گفتگو اور خطبوں میں کثرت سے استعمال ہوتی ہے۔ اسے اس بات کا اعلان سمجھ لیا گیا ہے کہ پچھلوں نے سوچنے سمجھنے کا کام مکمل کردیا ہے، اب ہمارا کام صرف اس عہد زریں کی نئے زمانے میں تشریح وتعبیر کرنا ہے۔ ہمارے خیال میں تین نسلوں کا canonization نہ صرف یہ کہ رسول اکرمؐ کے خطبۂ حجۃ الوداع سے ٹکراتا ہے جس میں آپؐ نے پہلی نسل کے مسلمانوں پر یہ ذمہ داری ڈالی تھی کہ وہ اس پیغام کو ان لوگوں تک لے جائیں جو یہاں موجود نہیں اور پھر وہ لوگ اپنے اگلوں کو منتقل کریں مبادا بعد والے اس پیغام کو زیادہ بہتر انداز سے سمجھ سکیں۔ کارِ نبوت کی یہ futuristic تعبیر اس بات پر دال ہے کہ انسانی تاریخ میں جس عظیم انقلاب کی بنیاد رسول اکرمؐ کے ہاتھوں رکھی گئی ہے اس کی تکمیل کا کام آنے والے دنوں میں انجام پانا ہے اور یہ کہ وحی کی بنیاد پر تشکیل پانے والے معاشرے کی معنویت اور اس کی برکات dilution کے بجائے نمو اور ارتقاء کے راستے پر گامزن رہنے کے لئے آئی ہے۔ یہی آخری نبی کی معنویت ہے[۱۳]۔

آخری رسول ﷺ کے عہد میں دین اپنی تکمیل کو پہنچ گیا۔ جیسا کہ ارشاد ہے ﴿**الیوم اکملت لکم**

دینکم واتممت علیکم نعمتي و رضیت لکم الإسلام دیناً﴾ (المائدۃ:۳) اس لئے اصولی طور پر دین کی تعبیر وتشریح کا مستند ترین ماخذ عہدِ رسولؐ کے ۲۳ سالہ ایام ہیں جس میں وحی کی روشنی میں ایک روایت اور ایک تہذیب اپنی بلوغت کو پہنچ گئی۔ البتہ یہ بات ہماری نگاہوں میں مستحضر رہنی چاہیے کہ ﴿**الیوم اکملت**﴾ تکمیل دین کا اعلان ہے کارِ رسالت کے اتمام کا نہیں۔ کارِ رسالت اپنے منطقی اتمام کو اسی وقت پہنچے گا جب عہدِ رسولؐ کو عالمی نظام عدل کی شکل میں قائم کیا جاسکے گا۔ گویا اسلام کے مطابق تاریخ کا سفر ابھی باقی ہے[۱۴]

وحی اور تاریخ

آگے جو کچھ بھی ہے ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ ہے۔ یہ محض خدا کا فضل ہے کہ وہ تاریخ کو گردشِ ایام پر چھوڑنے کے بجائے براہِ راست اس میں مداخلت کرتا رہتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتو انسان خود کو تاریخ کا قیدی محسوس کرے۔ ان معاشروں میں جہاں ایمان باللہ اور ایمان بالغیب کا داعیہ کمزور پڑ گیا ہے وہاں انسان اپنے آپ کو کچھ اسی کیفیت میں گھرا پاتا ہے۔ مغرب کے فلسفہ سازوں بالخصوص Heidegger, Bargason, Proust کے یہاں زمانے کے ہاتھوں مجبور انسان کے لئے راستہ بنانا ہنوز سب سے بڑا چیلینج ہے۔ البتہ جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں ان کے لئے تاریخ محض ایک وسیلہ ہے جس کے ذریعے اعلیٰ اہداف حاصل کئے جاسکتے ہیں کہ واقعات پر اپنی گرفت رکھنا اہلِ ایمان کے لئے ایک فطری وظیفہ ہے۔ چلتی پھرتی تاریخ جب انحراف کا شکار ہوجائے اور ایسا محسوس ہو گویا وہ خودکشی کے راستے پر جا نکلی ہے تب الٰہی مداخلت کا وقت آ پہنچتا ہے۔ پیغمبروں کا ظہور اسی انحراف کی درستگی کے لئے اور تاریخ کو دوبارہ ارتقائی راستے پر ڈال دینے کے لئے ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ کہ الٰہی مدافعت کا وقت کب آئے گا خالصتاً ایک خدائی فیصلہ ہے۔ پیغمبر اپنے مجاہدے یا عبادت و ریاضت کے نتیجے میں نامزد نہیں کئے جاتے۔ ان کا انتخاب بھی ایک خالصتاً خدائی امر ہے جس میں انسانی توفیق کو کوئی دخل نہیں۔

بعثتِ محمدیؐ کے بعد تاریخ پر مکمل کنٹرول آخری نبی کی امت کے لئے جس طرح الٰہی منصوبے کا حصہ ہے اس میں کلیدی حیثیت تو آخری رسول کو حاصل ہے البتہ آپؐ کی نیابت میں پوری امت شہداء علی الناس کے مرتبے پر فائز ہے۔ پیغمبرانہ تاریخ میں اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ایک ساتھ پوری امت نیابت کے منصب پر فائز کردی گئی ہو۔ اہلِ یہود جن کی سابقہ برگزیدگی کا تذکرہ قرآن میں جابجا موجود

ہے اور جن کے یہاں انبیاء کا ایک تسلسل دیکھنے کو ملتا ہے، وہاں بھی ایسا کبھی نہیں ہوا کہ تاریخ پر اپنی گرفت مضبوط بنائے رکھنے کے لئے پوری کی پوری امت نیابت کے منصب پر فائز کی گئی ہو۔ یہ پہلی اور آخری مرتبہ محمدؐ کی امت کے ساتھ ہوا ہے، جس کا مقصد اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ اب جب وحی براہِ راست تاریخ میں مداخلت نہیں کرے گی۔ آئندہ نسلِ انسانی کو انحراف اور گمرہی سے بچانے کے لئے پوری امت کو بیک وقت دنیا کے مختلف خطوں میں واقعات کی لگام اپنے ہاتھوں میں لے لینی چاہئے۔

وحی آسمان اور زمین کے رشتے سے عبارت ہے۔ نزول وحی لامتناہی سے محدود زمان و مکاں کی طرف ایک سفر ہے۔ ایک ایسی دنیا سے جہاں نہ زماں ہے اور نہ مکاں اور جہاں جو کچھ بھی ہے اس کا بیان ممکن نہیں۔ ایک ایسی انتہا سے اس بات کے اشارے، ہدایات اور رہنمائی انتہائی پیچیدہ phenomenon ہے۔ انسانی تاریخ کی چلتی گاڑی میں وحی کے Spark سے ایسے جھٹکے لگتے ہیں جس کے نتیجے میں جاری سفر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے رک گیا ہو، زمان ومکاں کی قیود اٹھالی گئی ہوں۔ یہ کہنا کچھ آسان نہیں کہ تاریخ جس سمت رواں دواں ہے، اس سفر کے خاتمے کے بعد آگے کیا ہے؟ یا یہ کہنا کہ تاریخ کے اس پار جہاں تاریخ کا سِرا ٹوٹ جاتا ہو، کیا کچھ ہے۔ البتہ اتنی بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ زمان و مکاں کی دنیا کا مابعد کائناتی نظام (meta-cosmic system) سے ایک گہرا تعلق ہے کہ تاریخ میں ہونے والی الٰہی مداخلت کے بغیر ہماری تاریخ معنویت سے خالی رہ جاتی ہے۔

اس دن کا بیان جب تاریخ کی تمام جہات (dimensions) اچانک تحلیل ہوجائیں گی، پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے، نظامِ شمسی اپنی معنویت کھودے گی، لیل و نہار کی گردش بے معنی ہوجائے گی۔ تب انسان دیکھ سکے گا کہ تاریخ کی اصل منزل تاریخ کے باہر ہے۔ تاریخ بمعنی ایام، دہر اور الساعۃ کے بارے میں قرآن ہمیں جو اجمالی تصور دیتا ہے اس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ اس نظامِ شمسی سے آگے بہت کچھ ہے، خود تاریخ کا بھی ایک اور تصور۔ آنے والے دنوں میں جیسے جیسے ہماری trans-cosmic معلومات میں اضافہ ہوتا جائے گا اور نظامِ شمسی سے باہر time اور space کے سلسلے میں ہمارے تصورات مزید واضح ہوتے جائیں گے، ہمارے لئے آخری رسول ﷺ اور اس کی امت کی معنویت اور تاریخ میں اس کے مجوزہ اور حتمی رول کو appreciate کرنا آسان ہوتا جائے گا۔ سرِ دست ہمیں اسی پر اکتفا کرنا چاہئے کہ گذشتہ صدیوں میں اس سرزمین پر امتِ مسلمہ کی معزولی کی شکل میں جو کائناتی حادثہ رونما ہوا ہے اور جس کے نتیجے میں تاریخ کا سفر شاہراہِ رسالت سے دور جا پڑا ہے، اتنے بڑے حادثے کی درستگی

کے لئے اگر براہِ راست آسمانی مداخلت نہیں ہورہی ہے تو اس کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ اب اس سرزمین پر potential نائبین رسول کی ایک قابل ذکر آبادی رہتی ہے، جس کے پاس آج بھی حجۃ من بعد الرسل کی حیثیت سے دفتین میں قرآن مجید موجود ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ امت مسلمہ کی معزولی انسانی تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ ہے، اس لئے بھی کہ اب کوئی دوسرا نبی نہ آئے گا۔ راست آسمانی مداخلت کا دروازہ بند ہے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ شیعہ ہوں یا سنی دونوں کے یہاں کسی نہ کسی شکل میں، خواہ اسے امام غائب کہیں یا مسیح موعود، مہدیٔ آخری الزماں کہیں یا مجدد وقت، ایک نئے ذیلی نبی (mini-Prophet) کا تصور موجود ہے۔ اور جب تک نئے نبی کی آمد کا انتظار باقی ہے ہمارے لئے تاریخ کے اندرونی انحراف پر قابو پانا آسان نہیں۔

تاریخ، وحی اور مستقبل شناسی

داخلی کمزوریوں کا سراغ لگانے اور نظری انحراف کے تجزیے کا کام اس لئے بھی مشکل ہوگیا ہے کہ **اولاً** ابتدائی تین چار صدیوں کو غالباً "**ثم الذین یلونھم**" کی وجہ سے تقدس کا درجہ حاصل ہے۔ **ثانیاً** اہل سنت والجماعت نے تاریخی ارتقاء کو جس طرح دین کے مستند ارتقاء کے مماثل قرار دے دیا ہے اس کی وجہ سے بھی تاریخ کو عقیدے کا سا تقدس مل گیا ہے۔ ان تاریخی مسلّمات کو چیلنج کرنا گویا مسلمہ عقیدے کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے۔ **ثالثاً** تاریخ کی جبری تفہیم کو ہم اصولی طور پر خواہ کتنا ہی برا بھلا کہیں جمہور مسلمین کا رویہ اسلامی تاریخ کو خدائی فیصلے کی حیثیت دے کر نظری طور پر مستند قرار دیتا ہے۔ **رابعاً** مستقبل کے سلسلے میں جو شاندار پیش گوئیاں بعض احادیث میں موجود ہیں اس نے بھی مستقبل کے سلسلے میں ہمارے رویے کو متاثر کیا ہے۔ اگر ہم یہ سمجھنے لگیں کہ ہمارا فکری اور تاریخی انحراف خدائی منصوبے کا حصہ ہے جس کا اگلا حصہ تنصیب سیادت پر مشتمل ہے تو تاریخ کے سلسلے میں نہ تو ہمارے یہاں کوئی تنقیدی رویہ پیدا ہوسکتا ہے اور نہ ہی مستقبل کے لئے کسی منصوبہ سازی کا داعیہ۔

آگے کیا ہے؟ اس بارے میں جاننے کی خواہش انسان کا فطری داعیہ ہے۔ اس سوال کا جواب یا تو تاریخ فراہم کرسکتی ہے یا وحی۔ تاریخ کا جواب قطعی نہیں ہوسکتا کہ اس کا کام ماضی کے محدود تجربات کی روشنی میں مستقبل کی پیش گوئی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے برتنے والوں کے لئے ﴿**فاعتبروا یا اولي الابصار**﴾ کا نعرہ بلند کرسکتی ہے۔ البتہ وحی قطعی علم ہے جس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ

ماکان ومایکون کا علم بندوں کی دسترس سے باہر ہے اِلّا یہ کہ وحی کسی خاص بارے میں واضح اشارہ کردے۔ ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو تاریخ کا فہم بھی "ماکان ومایکون" کا علم ہے جو انسان کی ذہنی سطح سے ہم آہنگ ہے۔ آنکھیں اگر کھل جائیں تو انسان تاریخ کی گردش میں مستقبل کے عاد وثمود کو متحضر دیکھے، واقعات کی زمانی ترتیب معنویت کھودے، ماضی، حال اور مستقبل کی تقسیم سے پرے انسان وہ سب کچھ دیکھ سکے جو ایک صاحب بینا کا حصہ ہوسکتا ہے۔ کسی صاحب بصیرت کے لئے مستقبل کی پیش گوئی "آیات الله في كون" کی تلاش کا عمل ہے، کائنات میں ایک منطقی ربط دریافت کرنے کی کوشش ہے کہ کس طرح ایک واقعہ کا منطقی نتیجہ دوسرا واقعہ لازماً ہوسکتا ہے الا یہ کہ خود اللہ کی سنت کے سابقہ نظائر کی روشنی میں کبھی کبھی مخصوص حالات میں آسمانی مداخلت محسوس ہو، فرشتے آسمان سے نزول کریں [۱۵] اور ایسا محسوس ہونے لگے گویا تاریخ چند لمحے کے لئے مبہوت ہوگئی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ وحی کی تکمیل کے بعد ہمارے لئے مستقبل شناسی کا واحد ذریعہ تاریخ رہ جاتا ہے جس کی تفہیم کی ایک سطح تو خود قرآن میں موجود ہے۔ آثار سے کس طرح مستقبل شناسی ممکن ہے یا کم از کم مستقبل کے حادثات سے بچنا ممکن ہے اس کا طریقۂ کار تو خود قرآن مجید میں تفصیل سے موجود ہے۔ انبیاء سابقین کے واقعات اور امم سابقہ کی کمزوریوں، غلطیوں اور انحراف پر جابجا تبصرے موجود ہیں، البتہ انسانوں کی یہ خواہش کہ اگر انھیں مستقبل کا علم حاصل ہوجائے تو اگلی منزلیں آسان ہوں۔ اس بارے میں قرآن واضح طور پر متنبہ کرتا ہے کہ غیب کا علم صرف اللہ کے پاس ہے حتیٰ کہ اس کے مقربین اور اولوالعزم انبیاء بھی اس علم سے نہیں نوازے گئے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ مستقبل کی لگام پوری طرح خدا کے ہاتھوں میں ہے بلکہ مستقبل کا علم بھی صرف اور صرف اسی کو ہے۔

قرآن پیشین گوئیوں کی کتاب نہیں، حالانکہ خدا اگر چاہتا تو امت مسلمہ کو واقعات کی زمانی ترتیب کے ساتھ مستقبل کا علم دے سکتا تھا۔ اہل یہود کے یہاں نبی کا تصور بڑی حد تک مستقبل شناسی اور کہانت سے عبارت ہے۔ یہودی عقیدے کے مطابق نبیوں کی موجودگی اس خدائی منصوبے سے آگہی کے لئے لازمی خیال کی جاتی ہے جس کی معلومات بنی اسرائیل کو خدائی منصوبے میں رنگ بھرنے کے لئے زیادہ بہتر طور پر تیار کرسکتی ہے۔ البتہ اسلام میں نبی کے منصب میں مستقبل شناسی کا کام شامل نہیں ہے۔ یہ بات کہ مستقبل کس طرح سامنے آئے گا، صرف اور صرف اللہ کو معلوم ہے۔

اگر کسی قوم کو پہلے سے یہ معلوم ہوجائے کہ آگے کیا ہے تو اس کے نتیجے میں وہ یا تو عمل کا ایک

بہترین منصوبہ ترتیب دے سکتی ہے یا یہ سوچ کر کہ مستقبل چونکہ پہلے سے طے ہے، ہماری منصوبہ بندی اس تاریخ مکتوب کو بدل نہیں سکتی، اس قوم میں مستقبل کے سلسلے میں سخت عدم دلچسپی پیدا ہوسکتی ہے۔ جس امت کے حوالے آخری ساعت تک سیادت کا فریضہ سونپا تھا، اسے مستقبل شناس تو بنایا جاسکتا تھا مستقبل گو نہیں۔ قرآن کا شعورِ تاریخ مستقبل بینی سکھاتا ہے مستقبل گوئی نہیں۔ مثال کے طور پر قرآن میں صرف ایک ایسے واقعہ کا بیان ہوا ہے جس میں تحدید وقت کے ساتھ وقت کی دو بڑی Super powers ایران و روما کے زوال کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ دس برسوں کے بعد تاریخ میں کیا کچھ ہوگا اور اسے کس طرح اپنے کنٹرول میں رکھا جاسکتا ہے اس بارے میں صرف اصولی مباحث کے بیان پر اکتفا کیا گیا۔ کوئی ایسی بات جس سے تاریخ کی جبری تعبیر کو تقویت ملتی ہو نہیں کہی گئی۔ گویا آگے جو کچھ بھی ہے وہ اہل ایمان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ بعثت نبویؐ کے ذریعہ تاریخ کی کمان اب آخری امت کے ہاتھوں میں ہے، وہ جس طرح چاہے اس فریضۂ منصبی کی حفاظت کرے۔ ہاں اس کی ہدایت کے لئے آخری وحی محفوظ شکل میں موجود ہے اور جس کی محفوظیت کا وعدہ خالق کائنات نے اہل ایمان سے کر رکھا ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے جب بھی ان امور پر گفتگو کی گئی جہاں انسانی اور انبیائی سرحدیں ختم ہوجاتی تھیں وہاں آپؐ نے اس قسم کے سوالوں کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ مثال کے طور پر روح کے بارے میں صرف یہ کہا گیا کہ یہ من جانب اللہ ہے، امر ربی ہے۔[۱۶] اسی طرح اصحاب کہف کی صحیح تعداد یا مدتِ قیام کے بارے میں کوئی جواب دینے کے بجائے اصولی طور پر یہ بات کہہ دی گئی کہ ان باتوں کا اصل علم صرف اللہ کو ہے۔ یہ لوگ محض ظن سے کام لے رہے ہیں[۱۷] حالانکہ خدا کا رسول جس وقت بہ نفس نفیس اس سرزمین پر موجود تھا وہ مکاں اور لامکاں کے مابین راست رابطے کے ایام تھے، لیکن ان ایام میں بھی خود رسول اکرم ﷺ کی زبان سے یہ کہلوادیا گیا کہ ﴿**ولو كنت أعلم الغيب لاستكثرت من الخير وما مسنى السوء ان أنا إلا نذير و بشير لقوم يؤمنون**﴾[۱۸]

مستقبل کا علم، یا مستقبل کے بارے میں بصراحت واقعات کی خبر دینا دراصل تاریخ سے کنٹرول ہٹا لینے کے مترادف ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جس نبی نے اپنے بارے میں اس عقیدے کو پروان نہ چڑھنے دیا کہ اسے غیب کا علم بھی حاصل ہے اور جو اپنے آپ کو ﴿بشرٌ مثلكم يوحىٰ الىّ﴾ (فصلت:۶) سے زیادہ کچھ بھی باور کرانا نہ چاہتا تھا اور جو تکمیل وحی پر جمہور امت کے مجمع عام میں ترسیل وحی اور شہادتِ حق کی گواہی لے چکا ہو اس کے بارے میں بعد کے متبعین نے نہ جانے کیسے یہ یقین کرلیا کہ رسول نے مستقبل

میں پیش آنے والے واقعات کی تفصیلی اور ترتیب وار خبر دے دی ہے۔ بخاری نے حضرت عائشہؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ آنحضرتؐ غیب جانتے تھے وہ دراصل اللہ پر بہتان باندھتا ہے۔[۱۹] قرآن مجید اور صحیح حدیث کی اس واضح تصریح کے بعد ان روایات کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے جن میں امت کے زوال، خلافت کا خاتمہ، مسیح موعود کی آمد، مہدی کا ظہور، دجال کا ورود وغیرہ واقعات کا تفصیلی بیان موجود ہے۔ ان روایات کو بلا چوں وچرا کسی تاریخی اور نظری تنقید کے بغیر قبول کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایک بار پھر خود کو جبری تاریخ کے حصار میں گھرا پائیں جہاں سے نکلنے کا راستہ اس وقت تک مسدود ہو جب تک کہ ندائے غیب خود یہ اعلان نہ کر دے کہ ہوشیار! تاریخ اب آگے بڑھا چاہتی ہے۔

مستقبل کے سلسلے میں احادیث کی مستند کتابوں میں جن موعودہ واقعات کا بیان موجود ہے ان میں خلافت کا تیس سال تک قائم رہنا،[۲۰] بارہ خلفاء کا ظہور، نبوت سے ملوکیت تک کے سفر اور پھر مسلسل زوال کے بعد آخری مرحلے میں دوبارہ منہج نبوت کی واپسی وغیرہ امور قابل ذکر ہیں۔[۲۱] منہج نبوت تک دوبارہ واپسی کا سفر اہل سنت کے یہاں مہدی اور مسیح موعود[۲۲] کے توسط سے بتایا گیا ہے، جبکہ شیعوں کے غالب فرقہ اثنا عشری میں یہ ذمہ داری امام غائب کے سپرد ہے جس میں بڑی حد تک خود مہدی کی شخصیت ضم ہوگئی ہے۔ مستقبل کے ان علوم کو اگر مستند ماخذ کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے تو اوّلاً ہمارے اسباب زوال کی عقلی توجیہہ معنویت کھو دیتی ہے۔ ثانیاً اصلاحِ احوال کا کوئی بھی پروگرام جب تک مسیح، مہدی، دجال اور امام غائب کی اسکیم سے میل نہ کھاتا ہو، اس کی کامیابی مشکوک اور اس کا وجود غیر ضروری قرار پاتا ہے۔ حالانکہ اس قبیل کی جتنی روایات ہماری مستند کتابوں میں در آئی ہیں ان کی سند مشکوک اور ان کے راویان کا سلسلہ مشتبہ ہے۔ لیکن صدیوں سے یہ روایات جس طرح ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی رہی ہیں اور جس طرح اس نے مسلم فکر میں اپنی ایک مستقل جگہ بنالی ہے ان سے پیچھا چھڑانا فی نفسہٖ ایک بڑا چیلنج ہے، البتہ اگر ایسا ہوسکا تو ہمارے لئے زوال کی تفہیم بھی آسان ہوگی اور اس سے نکلنے کا راستہ بھی بن سکے گا۔

تاریخ کی اہمیت اپنی جگہ مسلم، البتہ اس کا یہ مقام نہیں کہ وہ وحی کے ابعاد (Dimensions) متعین کرے۔ مستقبل کے سلسلے میں ہمارے یہاں جو التباس پایا جاتا ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم مستقبل کو وحی کے بجائے تاریخ کی روشنی میں دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ شاید اس لئے کہ وحی پر تاریخ کا پہرہ سخت ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تاریخ کو وحی کی تفہیم وتعبیر کا کلی اختیار دینے سے گریز کیا جائے۔ تبھی یہ ممکن ہے کہ ہم وحی سے صحیح معنوں میں اکتساب فیض کر سکیں۔[۲۳] تاریخ نے وحی کو مختلف

سطحوں پر متاثر کیا ہے۔ ایک سطح تو انسانی ذائچہ نویسی ہے جس کا شاہکار طبری کو سمجھا جاسکتا ہے۔ دوسری سطح پر وہ مستند مآخذ ہیں جو جرح و تعدیل کے مرحلے سے گزر کر حدیث کے مجموعوں کی شکل میں مرتب ہوئے ہیں۔ تیسری سطح ان قدیم مصاحف سماوی کی ہے جو تمام تر تحریف کے باوجود اب بھی تاریخ کے قدیم ترین مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاریخ ان تینوں سطحوں پر وحی کی تفہیم میں حارج ہوسکتی ہے اور معاون بھی۔ اصولی طور پر یہ بات طے کرنی ہوگی کہ تاریخ کو کس حد تک مداخلت کا حق دیا جاسکتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قدیم مصاحف سماوی اور احادیث کے مستند مجموعے محض تاریخی بیان سے کہیں بلند سطح کے حامل ہیں۔ البتہ یہ روایت در روایت کے جس تاریخی مرحلے سے گزر کر ہم تک پہنچے ہیں اُن میں انسانی فہم اور بیان کے رول کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ رہی غیر تقدیسی تاریخ، تو یہ بات اپنی جگہ طے ہے کہ طبری ہوں یا ابن اثیر یا کوئی اور، گزری ہوئی تاریخ کو الفاظ میں ہو بہو متشکل کرنا ممکن نہیں۔ ماضی کو حال میں اپنی تمام تر ابعاد کے ساتھ متصور کرنا، یا مستقبل کے لئے اسے محفوظ کر دینا انسانی فہم و بیان سے باہر ہے۔ یہ زمان و مکاں کی سطح پر تاریخ میں الٹے سفر کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لئے تاریخ خواہ وہ کسی بھی شکل میں یا کسی بھی سطح پر وحی کی تفہیم میں معاونت کر رہی ہو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کی معاونت تعبیر وحی میں حارج تو نہیں ہوگئی ہے۔ وحی کو تاریخ کے حصار سے نکالنا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ چودہ صدیوں کے علمی اور تہذیبی ورثے پر سوالیہ نشان لگانے کے مترادف ہے۔ لیکن جب تک ہم اپنے اندر اس علمی ورثے کے تنقید و احتساب کی جرأت پیدا نہیں کرتے، خود ہمارے مستقبل پر لگا ہوا سوالیہ نشان برقرار رہے گا، اور ہم آخری وحی کی موجودگی کے باوجود اس کی روشنی سے محروم رہیں گے۔

تعلیقات وحواشی

۱ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

﴿ذلک بأن اللہ مولی الذین آمنوا وان الکافرین لا مولیٰ لھم﴾ (محمد:۱۱)

کہتے ہیں کہ حضرت عمر کی خدمت میں ایرانیوں کا نامی جرنل ہرمزان لایا گیا تو آپ نے پوچھا کہ آخر کیا بات ہے کہ کل تم اتنے طاقتور تھے کہ ہم تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن اب تم کسی میدان میں ہمارے مقابلے کی تاب نہیں رکھتے:

کل تک طاقت کا مقابلہ طاقت سے تھا جس میں ہم بہت آگے تھے، خدا نہ تمہارے ساتھ تھا نہ ہمارے ساتھ۔ اب جس وقت ہم میں اور تم میں مقابلہ ہوتا ہے تو تمہارے ساتھ خدا ہوتا ہے اور ہمارے ساتھ نہیں ہوتا۔ (محولہ پرویز، اسلام آگے کیوں نہ چلا؟ ص۱۳)

۲ Theories of History, p. 294.

۳ ﴿محمد رسول اللہ والذین معہ أشداء علی الکفار رحماء بینھم﴾ (الفتح:۲۹)

۴ سراقہ بن مالک سے روایت ہے کہ آپ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ اے خدا کے رسول! ہمیں کچھ ہمارے دین کے بارے میں بتایئے۔ کیا ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ خدا کی طرف سے ہونا طے پا چکا ہے اور اس بارے میں فیصلے کی روشنائی خشک ہو چکی ہے، یا ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس بارے میں ابھی فیصلے کا لیا جانا باقی ہے۔ اس کے جواب میں رسولِ خدا نے فرمایا کہ اس بارے میں اللہ کا فیصلہ ہو چکا ہے اور اس کی سیاہی خشک ہو چکی ہے۔ تو پھر ہماری سرگرمیوں کی معنویت کیا رہ جاتی ہے، سراقہ کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے کہا: عمل کئے جاؤ، اس لئے کہ ہر شخص کے لئے وہ کام آسان بنا دیا گیا ہے جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے، اور پھر رسول خدا نے یہ آیت پڑھی ﴿فأما من اعطی واتقی وصدّق بالحسنی.....﴾الآیۃ.

مذکورہ حدیث کا متن یوں ہے:

فحدثنا عن ديننا هذا كأنا خلقنا له الساعة نعمل لشئ قد جرت به المقادير وجفت به الأقلام أم لشئ يستقبل قال: بل لشئ قد جرت به المقادير وجفت به الاقلام، قال ففيم العمل يا رسول الله ﷺ، قال اعملوا فكل ميسر لما خلق. قال ثم قرأ هذه الآية فاما من اعطى واتقى وصدق بالحسنى... (الى آخر الآية). (ابویوسف، آثار، قاہرہ ۱۳۵۵ھ نمبر ۵۸۱)

۵۔ مشکوٰۃ المصابیح، دہلی ۱۹۳۲ء، ص ۲۲

متن: القدرية مجوس هذه الامة ان مرضوا فلا تعودوهم وان ماتوا فلا تشهدوهم. (رواه احمد وابوداؤد عن عبدالله بن عمر)

۶۔ مشکوٰۃ المصابیح، دہلی ۱۹۳۲ء، ص ۲۲

متن: لاتجالسوا اهل القدر ولا تفاتحوهم. (رواه ابوداؤد)

۷۔ مشکوٰۃ المصابیح، دہلی ۱۹۳۲ء، ص ۲۰

متن: ان الله كتب على ابن آدم حظه من الزنا ادرک ذلک لامحالة فزنا العين النظر وزنا اللسان المنطق والنفس تتمنىٰ وتشتهى والفرج يصدق ذلک ويكذبه. (متفق عليه)

۸۔ مشکوٰۃ المصابیح، دہلی ۱۹۳۲ء، ص ۲۲

متن: ارأيت رقي نسترقيها ودواء نتداوى به وتقاة نتقيها هل ترد من قدر الله شيئاً؟ قال: هى من قدر الله. (رواه احمد والترمذى وابن ماجه)

۹۔ مشکوٰۃ المصابیح، دہلی ۱۹۳۲ء، ص ۴۶۲

متن: قال رسول الله ستكون فتن القاعد فيها خير من القائم والقائم فيها خير من الماشي والماشي فيها خير من الساعي... الى آخر الحديث. (رواه مسلم)

۱۰۔ ابویوسف، کتاب الآثار، قاہرہ ۱۳۵۵ھ، نمبر ۹۴۷ اور حاشیہ

متن: يا ابا ذر الا مرة امانة وهي يوم القيامة خزي وندامة الا من اخذها بحقها وادي الذي عليه فيها.

۱۱۔ مشکوٰۃ المصابیح، دہلی ۱۹۳۲ء، ص ۴۶۴

متن: كيف بك اذا ابقيت في حثالة من الناس مرجت عهودهم واماناتم واختلفوا فكانوا هكذا وشبک بين اصابعه قال: ماتأمرني قال: عليک بما تعرف ودع ماتنكر وعليک بخاصة نفسک واياک وعوامهم وفي رواية الزم في بيتک واملک عليک لسانک وخذ ماتعرف ودع ماتنكر وعليک بامر خاصة نفسک ودع امر العامة. (رواه الترمذی)

۱۲ مشکوٰۃ المصابیح، ص۵۵۳-۵۴

حدیث کا اصل متن یوں ہے: اكرموا اصحابي فانهم خياركم ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم ثم يظهر الكذب. (مشكوة المصابيح، ص: ۵۵۴)

خير امتي قرني ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم ثم ان بعدهم قوماً يشهدون ولا يستشهدون ويخونون ولا يوتمنون وينذرون ولا يفون ويظهر فيهم السمن.
(مشكوة المصابيح، ص: ۵۵۳-۵۴).

۱۳ بعض روایتی محدثین پر یہ خیال گراں گزرتا ہے کہ بعد میں آنے والے عہد رسول ﷺ کے مقابلے میں اس پیغام کو زیادہ بہتر طور پر سمجھیں۔ حدیث کے روایتی شارحین عہد رسول کے بعد اسلامی فکر میں مسلسل زوال کے قائل ہیں اور وہ اس قسم کی احادیث سے استدلال کرتے ہیں، جس میں کہا گیا ہے کہ ''کوئی وقت ایسا نہ آئے گا جو پہلے کے مقابلے میں خراب تر نہ ہو یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جاملو'' ان کا یہ بھی اعتراض ہے کہ کیا پہلی نسل کے مسلمان عقل وفہم میں کم تھے کہ بعد والوں سے پیغام کو بہتر انداز سے سمجھنے کی توقع کی جائے۔ ہمارے خیال میں ان احادیث کو جو بظاہر ایک دوسرے سے متضاد نظر آتی ہیں Futuristic perspective میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اولاً عہد رسول ﷺ ایک unique phenomenon ہے۔ اس کا مقابلہ نہ اس سے پہلے کسی لمحے سے کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی بعد میں اس جیسا کوئی پرتو انسانی تاریخ میں نظر آنے کا امکان ہے البتہ انسانی تاریخ وحی کی روشنی میں اپنی ارتقاء اور عروج کا جو سفر بھی طے کرے گی اسے اسی عہد رسول کے extention کی حیثیت حاصل ہوگی، جو اس سے بہتر نہیں ہونے کے باوجود تمام تر ہوگا۔ ان دونوں کے درمیان وہی رشتہ ہے جو کسی نمو اور بیج اور سرسبز شاداب درخت کے درمیان ہوتا ہے۔ ثانیاً اس میں صحابہ کرام کے عقل وفہم پر کوئی تنقید نہیں ہے بلکہ مستقبل کے علمی دھماکوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک ایسی دنیا کی پیش گوئی ہے جب عالمی نظامِ عدل کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ وسائل پیدا ہوجائیں گے، انسانی علوم اور تہذیب کی ترقی، قرآنی وحی کی تعبیر وتشریح کے نئے دروازے کھول دے گی۔ ثالثاً رسول اکرم ﷺ کے مشن کی تکمیل منطقی طور پر مستقبل میں ہونی چاہئے۔ عہد رسول ﷺ کو اس کام کی صرف ابتداء شمار کیا جائے گا جس کے بعد نمو اور ارتقاء لازمی ہے، زوال اور dilution نہیں۔

۱۴ امت مسلمہ کے لئے اپنے ماضی کو انتہائی عروج کا عہد قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ عہد عباسی کو مسلم تاریخ کا عہد زریں قرار دینا گویا مستقبل کو پیٹھ دکھانا ہے۔ اس روایتی تعبیرِ تاریخ کو صحیح مان لینے کا واضح مطلب یہ ہے کہ اب اسلام ایک finished phenomenon ہے، جس کی تہذیب فطری عروج پر پہنچنے کے بعد اب زوال سے دوچار ہے۔ تو یہ سب کچھ تاریخی عمل کا منطقی انجام ہے۔ ماضی کی دوسری تہذیبوں کی طرح اب اس کا مقام بھی تاریخ کا dust bin ہے، سیادت کا اسٹیج نہیں۔

۱۵ ﴿إن الّذين قالوا ربنا الله ثم استقاموا تتنزل عليهم الملائكة أن لا تخافوا ولا تحزنوا و أبشروا بالجنة التي كنتم توعدون﴾ (فصلت:۳۰)

۱۶ ﴿يسئلونک عن الروح قل الروح من أمر ربي﴾ (الاسراء:۸۵)

۱۷ ﴿قل الله أعلم بما لبثوا له غيب السمٰوٰت والأرض.....﴾ (الکہف:۲۶)

۱۸ الاعراف:۱۸۸

۱۹ ربیع بنت معوذ بن عفرا کی رخصتی کے بعد حضورﷺ ان کے گھر تشریف لے گئے۔ دولڑکیاں دف پر گاتی تھیں اس میں ایک مصرعہ یہ بھی تھا: وفينا نبي يعلم ما في غد.

''ہم میں ایک پیغمبر ہے جو آنے والے کل کی بات بھی جانتا ہے۔''

حضورﷺ نے فرمایا: اسے چھوڑ کر وہی کہو جو پہلے کہہ رہی تھی۔ (رواہ البخاری)

محولہ اسلام اور موسیقی، جعفر شاہ پھلواروی، لاہور ۱۹۷۷ء، ص ۱۳۴۔

احناف کی معتبر تفسیر ''مدارک'' میں غیب کی تعریف جس طرح کی گئی ہے اس میں رسول کے لئے مستقبل بینی کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی: الغيب هو مالم يقم عليه دليل ولا اطلع عليه مخلوق.

یعنی غیب ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جن پر کوئی دلیل قائم نہیں اور نہ کسی مخلوق کو ان کی اطلاع ہے۔

۲۰ ترمذی نے احمد بن منیع البغوی سے کہ وہ شریح بن نعمان البغدادی سے اور وہ حشرج بن نبایا الکوفی سے اور وہ سعید بن جمحان سے اور وہ سفینہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا:

"الخلافة في امتي ثلاثون سنة تم ملک بعد ذلک ثم قال سفينة امسک خلافة بأبي بكر ثم قال وخلافة عمر وخلافة عثمان ثم قال وامسک خلافة علي فوجدناها ثلاثين سنة. قال سعيد فقلت له أن بني امية يزعمون أن الخلافة فيهم قال كذبوا ابن الزرقائيل. هم

ملوک من شر الملوک.

سفینہ جو رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے، کا سال وفات ۷۴ھ ہے۔ محدثین نے سلسلۂ راویان میں حشرج بن نبایا الکوفی کے بارے میں ان کا ضعیف الحدیث اور **لایحتج به من منکر الحدیث** ہونا لکھا ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ سفینہ سے عجیب وغریب حدیثیں روایت کرتے ہیں۔ امام بخاری انہیں ثقہ نہیں سمجھتے۔ یہی معاملہ سعید بن جمحان کا ہے جن کا سال وفات ۱۳۶ھ ہے۔ سفینہ اور سعید کے سال وفات میں کوئی ۶۲ سال کا فرق ہے پھر یہ کہ سفینہ مدنی تھے اور سعید بصرہ کے رہنے والے۔ اب اگر ذرا حدیث کے انداز بیان پر غور کریں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ کہنے والے نے واقعات کے گزرنے کے بعد اسے روایت کیا ہے۔ پھر یہ کہ کسی صحابی کے لئے جو رسول اللہ کے آزاد کردہ غلام ہوں، جنہیں آپؐ کی صحبت سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا ہو، یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ بنو امیہ کو زرقائیل کے بچے کہیں گے۔ یہ قرآنی حکم ﴿**لا تنابزوا بالالقاب**.....﴾ کی صریح خلاف ورزی ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حدیث دراصل اس حدیث کا توڑ کرنے کے لئے بنائی گئی تھی جن میں بارہ خلفاء کے ورود مسعود کی خبر دی گئی ہے۔ خلافت کے بارے میں تیس سال کی پیش گوئی ہو یا اسے بارہ خلفاء تک وسیع کیا جائے دونوں خبر میں مستقبل کے سلسلے میں ایک سخت مایوسی ہے۔ جو دین "**الساعة**" تک قائم رہنے کے لئے آیا ہے اس کے بارے میں اگر رسول مقبول کی زبانی یہ پیش گوئی صحابہ کی عام معلومات کا حصہ ہو کہ بارہ خلفاء یا تیس سالوں میں یہ سلسلہ انقلاب اپنے منطقی انجام کو پہنچ جائے گا، تو کوئی وجہ نہیں کہ صحابہ کرام آپؐ سے فتنے کی اس نازک گھڑی میں پیشگی ہدایات کے طالب نہ ہوتے۔ اور خود جس رسول کو آخری نبی کے منصب پر سرفراز کیا گیا ہو۔ اس نے بھی امت کے لئے صورت حال کے ازالے کے لئے واضح لائحہ عمل نہ چھوڑا ہوتا۔ اس قبیل کی باتوں کو جو امت کے مستقبل سے متعلق تھیں خبر آحاد پر چھوڑنے کے بجائے عمومی گفتگو کا موضوع بنایا جاتا اور اس بارے میں کم از کم خطبہ حجۃ الوداع میں اجمالی اشارے تو یقیناً ملتے۔ لیکن اس کے برعکس مستقبل کی پیشگوئیوں کے بارے میں آپؐ کی مجلسیں خاموش ہیں۔ بالخصوص آپؐ کے اصحاب کا وہ قریب ترین اور ذہین ترین حلقہ جو آیت تکمیل کے نزول سے مستقبل کا اشارہ سمجھ سکتا تھا اور جسے صاف لگ رہا تھا کہ اب تکمیل دین کے بعد رسول کا سفر آخرت ایک منطقی منزل ہے، اس نے بھی رسولؐ سے مستقبل کا علم دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ اس آیت میں رسولؐ کے وصال کی خبر اتنی مترشح تھی کہ یہ آیت سن کر بعض صحابہ کرام کی آنکھیں آب دیدہ ہوگئی تھیں۔ حج سے واپسی کے بعد آپؐ کے وصال تک کے عرصے میں جن اکابر صحابہ کو آپؐ کے اردگرد رہنے کا موقع ملا ان میں بھی کوئی قابل ذکر نام مستقبل شناسی کے حوالے سے نہیں آتا۔ حالانکہ لوگوں کو یہ صاف نظر آرہا تھا کہ رسول اب دنیا سے جانے والے ہیں۔ ابوبکرؓ

کو مسجد نبوی کی قیادت پر نام زد کیا جاچکا ہے، اس قبیل کی وصیتیں کی جارہی ہیں کہ اہل کتاب نے جس طرح اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا تم لوگ میری قبر کے ساتھ ایسا نہ کرنا۔ شب وروز کی ان سرگرمیوں میں نہ تو بارہ خلفاء کا کوئی تذکرہ ہے اور نہ ہی تیس سال میں اس انقلاب مسعود کے ختم ہوجانے کی خبر بد کا ذکر۔ رسولؐ اس اطمینان قلب کے ساتھ دنیا سے جارہا ہے کہ اس نے اپنا کام مکمل کردیا۔ وحی کی روشنی میں ایک معاشرہ تشکیل پا چکا ہے جسے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی روشنی میں اپنی توسیع اور ارتقاء کا سفر جاری رکھنا ہے۔ معاشرے کو جن خطوط پر قائم کیا گیا ہے خود اس کے اندر یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ مستقبل کے چیلنج کا مقابلہ کرسکے۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت جیسے اہم مسئلے کا جس پر امت کا اتحاد اور مرکزیت منحصر تھا اور جس کا سامنا آپؐ کے وصال کے بعد فی الفور امت کو کرنا تھا اس بارے میں بھی خاموشی اختیار کی گئی، اور یہ کام پہلی نسل کے مسلمانوں پر چھوڑ دیا گیا۔ کہ وہ اب اس لائق ہوچکے تھے کہ اس نازک ترین مسئلے پر بھی "امرھم شوریٰ بینھم" کے مطابق فیصلہ لے سکیں۔ جب آپؐ کا رویہ مستقبل قریب میں بھی معینہ ہدایات دینے کا نہیں تھا، اور جب یہ ایک امر واقعہ ہے کہ مسئلہ خلافت یا نیابت کے بارے میں آپؐ نے عوامی طور پر کوئی ہدایت نہیں چھوڑی تو پھر مستقبل شناسی کے سلسلے میں خبر آحاد خواہ وہ تیس برسوں والی خلافت ہو، بارہ خلفاء کا معاملہ ہو یا شیعہ نقطہ نظر کے مطابق غدیر خم اور حدیث کساء کا واقعہ ہو، عام عوامی معلومات کے مقابلے میں ان اخبار آحاد کو مستند نہیں قرار دیا جاسکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ بارہ خلفاء کی حدیث صحاح میں نقل ہوجانے کے بعد علمائے اہل سنت کے لئے سخت مشکل کا باعث بنی رہی ہے۔ اسے درست قرار دینے کا مطلب بنوامیہ کے ان خلفاء کو بھی تقدس حاصل ہوجاتا ہے جن کے بارے میں منہج نبوت سے انحراف کا خیال عام ہے۔ ہمارے خیال میں تاریخ کے بارے میں اس قبیل کی پیش گوئی صرف سیاسی حالات کی پیداوار نہیں بلکہ اس کے پیچھے اہل کتاب کے ان علماء کا بھی دخل ہے جو اپنی سابقہ مذہبی معلومات کے ساتھ دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے تھے۔ تمام تر خلوص کے باوجود ان کا سابق علم کہیں تو تفہیم اسلام میں حارج نظر آتا ہے اور کہیں اس سے متصادم۔ بارہ خلفاء کی گنتی کو اہل یہود کے بارہ قبیلوں کی روشنی میں دیکھنا چاہیے جس کا تذکرہ خود قرآن میں موجود ہے۔ ﴿فانفجرت منه اثنتا عشرة عينا قد علم كل اناس مشربهم.....﴾ (البقرۃ: ۶۰)

اہل تشیع نے بارہ خلفاء کی تاویل میں ائمہ معصومین مامورین کا عقیدہ ایجاد کرڈالا۔ البتہ تاریخ کی طرف سے اٹھائے جانے والے اس سوال کا جواب ان پر بھی باقی ہے کہ جن ائمہ کرام پر ایمان لانا اور ان کی رہنمائی قبول کرنے کو مدار دین میں شمار کیا گیا ہو، اس بارے میں کوئی واضح ہدایت یا اشارہ آپؐ کی عوامی مجلسوں یا از دہام عام میں کیوں نہیں ملتا؟ واقعہ یہ ہے کہ خلفائے اربعہ کا عقیدہ ہو، تیس سال خلافت کا

منہاج نبوت پر قائم رہنے کا معاملہ ہو یا بارہ ائمہ مامورین کا عقیدہ، یہ سب بعد کی صدیوں کی پیداوار ہے۔ اسے مستقبل کا علم قرار دے کر تاریخی بنیادوں پر مستند قرار دینا ممکن نہیں۔

۲۱۔ **قال رسول الله ﷺ تكون النبوة فيكم ما شاء الله ان تكون ثم يرفعها الله تعالى ثم تكون خلافة على منهاج النبوة ماشاء الله ان تكون ثم يرفعها الله تعالىٰ ثم تكون ملكاً عاضاً فتكون ماشاء الله أن تكون ثم يرفعها الله تعالىٰ ثم تكون ملكا جبرية فيكون ماشاء الله أن يكون ثم يرفعها الله تعالىٰ ثم يكون خلافة على منهاج النبوة.**

(مسند احمد والبيهقى فى دلائل النبوة.....)

اور اسی قسم کی ایک اور حدیث:۔ **عن ابي عبيدة و معاذ بن جبل عن رسول الله ﷺ قال ان هذا الامر بداء نبوة ورحمة ثم يكون خلافة ورحمة ثم ملكا عضوضا ثم كائن جبرية وعتوا وفسادا في الارض يستحلون الحرير والفروج والخمور يرزقون على ذلک وينصرون حتى يلقوا الله ـــ(رواه البيهقى فى شعب الايمان)**

ان دو احادیث کی روشنی میں عہد نبوت سے **قیام الساعۃ** تک کی تصویر کچھ یوں بنتی ہے۔ اولاً عرصۂ نبوت، اس کے بعد خلافت و رحمت اور اس کے بعد انسانی تاریخ ملکاً عضوضاً کے مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے۔ پھر جبری بادشاہوں کا دور ہے، **فساد فی الارض** کا ماحول ہے جس کے بعد دوبارہ اجتماعی نظام منہج نبوت پر واپس آجاتا ہے۔ لیکن خلافت کی یہ واپسی آخری ساعت سے پہلے نہیں ہے۔ یہ بات بھی محل نظر رہے کہ آخری رسول کی زبانی مستقبل کی کوئی تصویر کشی گویا تاریخ عالم کی تصویر کشی ہے۔ ورنہ رسول کی حیثیت ایک قومی یا ملی نبی کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ جو لوگ اس قبیل کی حدیثوں سے مستقبل شناسی کی کوشش کرتے ہیں انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ حدیثیں عالم گیر سطح پر تاریخی انقلاب کا احاطہ نہیں کرتیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بنی اسرائیل کا کوئی قومی پیغمبر اپنی تاریخ کے بارے میں مستقبل کی طرف کچھ اشارے کر رہا ہے اور بس۔ ہمارے خیال میں سند سے قطع نظر اس قسم کی حدیثیں رسول اللہ کے مرتبے سے بہت ہی فروتر ہیں۔ یہ ساری غلط فہمی اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ ہم ملی تاریخ کو عالمی تاریخ سے الگ سمجھنے کے عادی ہو گئے ہیں اور یہ بات ہمارے ذہنوں سے محو ہو گئی ہے کہ ہم وہ لوگ ہیں جن کی مٹھی میں مستقبل کی عالمی تاریخ دی گئی ہے۔ اس حدیث کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ اس کا اطلاق عالمی تاریخ پر ہو، اموی اور عباسی حکومتوں کے تسلسل پر نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ خود اس حدیث کے مطابق خلافت علی منہاج النبوۃ، جسے یہاں دوسرے مرحلے کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے، کا عالمی سطح پر ابھی دنیا کو اس کا مشاہدہ کرنا باقی ہے۔ اس

کے بعد ہی ملکاً عضوضاً یا ملکاً جبریۃً کا مرحلہ آئے گا۔ اس لئے جو لوگ آخری امت کی تاریخ کو عالمی سیاق سے ہٹا کر ایک محدود گروہی عمل کی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، انہیں یہ جان لینا چاہیے کہ خود ان کی پیش کردہ حدیثوں کے مطابق ہم ابھی اس مرحلے میں داخل نہیں ہوئے ہیں جب مسیح موعود اور مہدی آخر الزماں کے انتظار میں اپنا وقت ضائع کریں۔ ابھی تو عالمی خلافت کا مرحلہ ہی انجام نہیں پایا ہے اس سے پہلے ہی امت مامور بعض حادثے کا شکار ہو کر عملی طور پر امت معزول میں تبدیل ہو چکی ہے۔

صحیح مسلم میں ایک حدیث اس طرح نقل ہوئی ہے "عن نافع بن عتبه قال: قال رسول الله ﷺ: **تغزون جزيرة العرب فيفتحها الله ثم فارس فيفتحها الله ثم تغزون الروم فيفتحها الله ثم تغزون الدجال فيفتحه الله.** (رواه مسلم)

اس حدیث کو مستقبل شناسی کی بنیاد بنایا جائے تو اسے زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ ایران و روما کے جس زوال کی پیش گوئی قرآن میں بصراحت کی گئی ہے اور جس کا دنیا نے دس برسوں کے اندر عملی طور پر مشاہدہ کر لیا، اس حدیث کو اسی قرآنی wisdom کا تتمہ سمجھنا چاہیے۔ لیکن جو لوگ ان حدیثوں کی بنیاد پر مستقبل شناسی کی پوری ایک dicipline قائم کرنے کے درپے ہیں ان کے لئے جزیرۃ العرب میں اسلام کا غلبہ پہلا مرحلہ، سلطنت ایران کا زوال دوسرا مرحلہ اور ترکی سلطان محمد کے عہد میں قسطنطنیہ کی علامتی فتح (۱۴۵۳) تیسرا مرحلہ قرار پائے گا۔ اب آگے صرف دجال کا ظہور باقی ہے۔ اور دجال کے ساتھ ہی مہدی کا ظہور اور مسیح برحق کا نزول اس مستقبل شناسی کا لازمی حصہ ہے۔ کیا خواص اور کیا عوام، یہ بات مسلمانوں کے دل و دماغ میں بیٹھ گئی ہے کہ ہم اپنے زوال کے نتیجے میں آخری عہد سے قریب آ گئے ہیں، جہاں ظہور دجال کے ساتھ ہی غلبہ حق کا آخری مرحلہ طے ہونا باقی ہے۔ صورت حال اتنی خراب ہے کہ جو لوگ اس عہد میں دین کی انقلابی تفہیم کے حوالے سے جانے جاتے ہیں اور جنہیں احیائے دین کے ہراول دستے کی حیثیت حاصل ہے ان کے یہاں بھی مہدی آخری الزماں کا انتظار اسلامی عقیدے کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ یہ حضرات اس بات کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ اس قبیل کی خبروں کے راویوں کا پتہ لگائیں اور پھر نقد حدیث کے مسلمہ اصولوں کے مطابق ان تصورات سے امت مسلمہ کو نجات دلائیں۔ تاکہ ہم میں منہج نبوت کی تفہیم اور اس کے ذریعے دوبارہ منصب سیادت پر مامور ہونے کا داعیہ پیدا ہو سکے۔

مہدی آخری الزماں کی آمد ہو یا مسیح موعود کے ظہور کا مسئلہ، امام غائب کا انتظار ہو یا مستقبل کے مجدد کی تلاش۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ تصورات ختم نبوت سے براہ راست متصادم ہیں۔ آنے والا آ چکا ہے۔ اب اس کے بعد کوئی نہ آئے گا۔ زمین کا آسمان سے رابطہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہو چکا ہے۔ اب جو کچھ کرنا ہے اسی امت کو کرنا ہے جس کے لئے کتاب محفوظ کے حوالے سے ﴿**انا له لحافظون**﴾ کا وعدہ ہے اور بس۔

لیکن مصیبت یہ ہے کہ بڑے بڑوں کے دماغ پر ایک نئے نبی کی آمد کا انتظار کچھ اس طرح حاوی ہے کہ سنجیدہ علمی تنقید اور صدیوں سے مسلسل کی جانے والی نفی بھی ان خود ساختہ تصورات سے امت کو نجات دلانے میں ناکام رہی ہے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ حجۃ من بعد الرسل ہے۔ نبی کی غیر موجودگی میں صرف اس کا وجود ہی امت کو منہج نبوت پر قائم رکھنے کے لئے کافی ہے۔ اندرونی انحراف اور نظری التباس کی درستگی کا یہاں شافی سامان موجود ہے اور یہ کہ قرآن کا وعدۂ استخلاف آج بھی ان شرائط کے ساتھ امت کے لئے ایک عملی وعدہ ہے۔ لیکن ہم جو سہل پسندی کے خوگر اور آباء پرستی کے مریض ہیں ہمارے لئے خود براہ راست اس الٰہی پیغام کا سمجھنا اور اس دعوت کو قبول کرنا ایک امر صعب ہے۔ اصولی طور پر تو ہم نبوت کے دروازے کو بند سمجھتے ہیں لیکن عملی طور پر ایک چھوٹے نبی کی آمد کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ اصحاب اہل السنّت والجماعت کے وہ اہل علم بھی جو امام غائب، مہدی یا مسیح کی آمد کو اسلامی عقیدے سے متصادم بتاتے ہیں ان کے یہاں بھی مجدد کی آمد کا جواز موجود ہے۔ اور ایک larger-than-life-size قائد کے لئے یہاں بھی جگہ خالی ہے۔ حتی کی ابوالاعلیٰ مودودیؒ جیسا شخص بھی، جن کی اسکیم میں کسی کے لئے منصب بزرگی کا حصول ایک مشکل کام ہے، وہ بھی ایک مجدد کامل کی آمد کا مژدہ سنائے بغیر نہیں رہ پاتا۔ بقول ان کے ''مجدد کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے مگر عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے اور دنیا کے حالات کی رفتار تقاضا کرتی ہے کہ ایسا لیڈر پیدا ہو، خواہ اس دور میں پیدا ہو یا زمانے کی ہزاروں گردشوں کے بعد پیدا ہو۔ اسی کا نام الامام المہدی ہوگا جس کے بارے میں صاف پیشین گوئیاں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام میں موجود ہیں۔'' (تجدید واحیائے دین ص ۴۹)

امام مہدی، امام غائب، مسیح موعود اور مجدد کے سلسلے میں ہمارے یہاں مقبول عام مجموعوں میں جو تفصیلات ملتی ہیں ان کی بنیاد پر مستقبل شناسی کا پورا فن وجود میں آ گیا ہے۔ البتہ جن لوگوں نے ان روایتوں کی سند کی جانچ پڑتال کی کوشش کی ہے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان قصے کہانیوں کو رسول اللہؐ سے دور کی بھی نسبت نہیں۔ ہمارے خیال میں مستقبل شناسی کی یہ پوری ڈسپلن یہودی مآخذ سے درآمد کی گئی ہے، جس میں تخیلاتی رنگ بھرنے میں عہد عباسی کی عجمی ثقافت کو خاصا دخل ہے۔ اس بارے میں ہم تفصیلی بحث دوسرے باب میں کریں گے۔ یہاں صرف اس وضاحت پر اکتفا کرتے ہیں کہ مجدد کے سلسلے میں جو معروف حدیث ہمارے علم کا حصہ بن چکی ہے، جس کا تذکرہ ابوداؤد میں ملتا ہے، وہ سند تو درکنار خود متن کی بنیاد پر ثقہ قرار نہیں دی جاسکتی۔ حدیث کے اصل الفاظ یوں بتائے گئے ہیں۔

''**عن ابي هريرة فيما أعلم عن رسول الله ﷺ إن الله يبعث في امتي على رأس كل مأة من يجدد لها دينها.**'' (ابوداؤد کتاب الملاحم)

محدثین کے نزدیک رجال کی بنیاد پر یہ حدیث انتہائی ضعیف ہے۔لیکن روایتی علماء کا یہ اصرار ہے کہ ''ایسی بہت سی حدیثیں ہیں جن کی سند میں کلام کیا گیا ہے مگر واقعہ نے ان کی صداقت کی توثیق کردی ہے۔ یہی حال اس حدیث کا بھی ہے اور تاریخ اسلام اس کی صداقت کی شاہد ہے۔'' (مولانا شاہ سید سلیمان ندوی فی مقدمہ) کتاب تجدید دین کامل،عبدالباری لکھنؤ ۱۹۵۶ء

اس ایک مفروضہ حدیث کی وجہ سے پوری امت کوئی ہزار سال سے اس بحث ومباحثے میں الجھی ہوئی ہے کہ کسے واقعی مجدد قرار دیا جائے۔اور کسے مجدد کامل کے منصب پر سرفراز کیا جائے۔ چوں کہ اس حدیث کی سند میں خود روایتی ثین کو کلام ہے اس لئے ہم یہاں رجال کی بحثوں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے صرف متن کے تجزیے پر امحد کتفا کرتے ہیں۔

یہ بات کہ اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر کوئی مجدد پیدا کرے گا اس لئے بھی قول رسول نہیں ہوسکتا کہ آپؐ کے عہد میں ہجری صدی کا موجودہ تصور نہیں پایا جاتا تھا۔ ہجرت کو باضابطہ کیلینڈر کے طور پر استعمال کرنے کا کام حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہوا ہے۔ اس لئے جو لوگ پہلی صدی ہجری کے آخری سرے پر عمر بن عبدالعزیز کو منصب خلافت پر سرفراز پا کر اس حدیث کی صحت کا جواز پیش کرتے ہیں انہیں اس تاریخی حقیقت کو سامنے رکھنا چاہیے۔ دوسری بات جو اس سے بھی کہیں زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ ہر صدی میں کسی مجدد کی شناخت کا کام کیسے انجام پائے گا، اس بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی گئی ہے۔ کسی ایسی بھرپور قیادت کی شناخت کا جب تک کوئی طریقہ نہ بتایا جائے اس کے ظہور سے امت کس طرح استفادہ کرسکے گی۔ اس حدیث نے بڑے بڑے اہل علم کو اس تردد میں مبتلا رکھا ہے کہ کس صدی کا مجدد کون ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے امام احمد بن حنبل نے عمر بن عبدالعزیز متوفی ۱۰۱ھ کو پہلی صدی ہجری اور امام شافعی متوفی ۲۰۴ھ کو دوسری صدی کے مجدد کے طور پر متعارف کرایا۔ اس کے بعد ہر صاحب علم نے اپنی نگاہ اور بصیرت کے مطابق مختلف اصحاب علم وفضل کو اس منصب پر فائز کیا۔ کہا جاتا ہے کہ تیسری صدی کے مجدد ابوالحسن اشعری، چوتھی کے امام الحرمین جوینی اور پانچویں کے غزالی ہیں۔بعض حضرات نے پچھلی صدیوں کے مجدد کی شناخت کے بعد اپنا نام نامی بھی اس فہرست میں شامل کرانا ضروری سمجھا۔ جلال الدین سیوطی نے پہلی سے آٹھویں صدی تک بالترتیب عمر بن عبدالعزیز،امام شافعی، حافظ ابن شریح، امام باقلانی، امام غزالی، امام رازی، ابن دقیق العید، امام بلقینی وغیرہم کے شمار کے بعد نویں صدی میں خود اپنا نام نامی اس عہدۂ مبارکہ کے لئے پیش کردیا۔لیکن اسی صدی میں امام سخاوی بھی ہیں جن کا دعویٰ اس منصب کے لئے برقرار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حافظ سیوطی چونکہ شافعی المسلک تھے اس لئے انہوں نے اپنے ہم مسلکوں کے نام اس فہرست میں بھر دئے ہیں۔ ہندوستان میں جہاں احمد سرہندی کو دوسرے الفیے کے

مجدد اعظم کی حیثیت حاصل ہے، انہیں اس بات پر اصرار ہے کہ سو کی گنتی تو اپنی جگہ، ہزار کا بھی اپنا ایک خاص مقام ہے۔ اتنے اہم مسئلے کو طے کون کرے اور کسے منصب تجدید پر مامور سمجھا جائے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر کوئی بارہ صدیوں سے ہمارے یہاں بحث چل رہی ہے۔ جیسا کہ ہم نے عرض کیا بعض حضرات تو کسی کو بھی مجدد کامل ماننے کو تیار نہیں ان کے مطابق ابھی ایک کامل مجدد کا ظہور باقی ہے۔ احمد سرہندی کو مجدد کا لقب ملا عبدالحکیم سیالکوٹی نے دیا جو رفتہ رفتہ ان کے نام کا جز بن گیا۔ برصغیر ہندو پاک کے شیخ الاعظم مولانا اشرف علی تھانوی سے جب یہ پوچھا گیا کہ کیا حضرت مجدد وقت ہیں تو آپ نے فرمایا ''احتمال تو مجھ کو بھی ہے مگر اس سے زائد نہیں، جزم اوروں کو بھی نہیں کرنا چاہئے، ظن کے درجہ میں گنجائش ہے، باقی قطعی یقین تو کسی مجدد کا نہیں۔''

(محولہ ص ۲۵، تجدید دین کامل عبدالباری)

ایک قصہ جس کا سرے سے فسانے میں کوئی ذکر نہ ہو وہ ہمارے ارباب حل وعقد کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لے کہ کوئی تو مجدد کامل کی آمد پر اصرار کرے اور کسی کو یہ ظن ہو کہ کیا پتہ جس مردے از غیب کا انتظار تھا وہ خود اس کی ذات میں جلوہ گر ہے۔ چوں کہ ہمارے یہاں تاریخ کے مطالعے میں اور اسلاف کے علمی ورثہ کے مطالعہ میں تنقیدی رجحان کے بجائے معتقدانہ رویہ کو پرورش دی گئی اس لئے جب ایک بار کوئی غلط تصور غلط حوالوں کے توسط سے قدماء کی کتابوں میں راہ پا گیا تو اس کی اصلاح کے بجائے ان غلطیوں پر مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ ہمارے خیال میں سب سے پہلے مجدد کے سلسلے میں اس حدیث کی باز گشت مامون کے عہد میں سنائی دیتی ہے جو دوسری صدی کے سرے پر مسلم دنیا کی کمان سنبھالے ہوئے ہے۔ اس عہد میں سیاسی ضرورتوں کے تحت ایسی حدیثوں کا منظر عام پر لایا جانا کچھ حیرت ناک عمل نہیں۔ صدی کے پہلے سرے پر عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے جلیل القدر شخص کی موجودگی سے ممکن ہے مامون اور اس کے حواریوں کو اس حدیث کے ذریعہ اعتبار حاصل کرنا مقصود ہو۔ امام احمد بن حنبلؒ جو اس دور میں حکومت مخالف اولوالعزم قیادت کے حیثیت سے چھائے ہوئے ہیں، ان کا یہ کہنا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے بعد دوسری صدی کے مجدد امام شافعی ہیں، دراصل مامون کو اس حدیث سے ہونے والے فوائد سے روکنے کی کوشش ہے۔

۲۲ حضرت مسیح کے بارے میں قرآن صراحت کے ساتھ ﴿متوفیک﴾ کا لفظ استعمال کرتا ہے: ﴿انی متوفیک ورافعک الی﴾ (آل عمران:۵۵) اس عالم رنگ وبو میں ہر شخص کے لئے موت مقدر کردی گئی ہے: ''کل نفس ذائقة الموت'' دراصل اسی حقیقت کا اعلان ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک جلیل القدر پیغمبر تھے جنہیں بنی اسرائیل میں روحانی زندگی کا صور پھونکنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ افسوس کہ

بنی اسرائیل جو عرصۂ دراز سے ایک مسیحا کے منتظر تھے حضرت مسیح کی شکل میں جب انہیں یہ نعمت عظمیٰ میسر آئی تو وہ اس موقع سے فائدہ تو کیا اٹھاتے الٹے انھوں نے مسیح اور ان کے حواریوں پر زندگی تنگ کردی۔ بلکہ وہ تو اپنی دانست میں انہیں صلیب پر بھی چڑھا چکے۔

قرآن وفات مسیح کے بارے میں بہت زیادہ تفصیلات فراہم نہیں کرتا۔ البتہ "**رافعک**" کے لفظ سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام زندہ حالت میں آسمان کی طرف اٹھائے گئے ہیں اور اسی لئے ان کے دوبارہ نزول کے سلسلے میں خیال عام ہوگیا۔ ہمارے یہاں بعض مفسرین نے یہودی مآخذ سے استفادہ میں سادہ لوحی کا مظاہرہ کیا ہے۔ جس کے نیچے میں عیسائی اور یہودی قصے کہانیوں کے ذریعے اہل کتاب کے بعض مذہبی عقائد اور تصورات ہمارے یہاں داخل ہوگئے ہیں۔ ہمارے خیال میں نزول مسیح کا تصور بیرونی مآخذ سے برآمد کردہ خیال ہے۔ جس کی تفصیلات قرآن مجید کے اندر موجود نہیں ہے۔ اور نہ ہی قرآن سے ان تصورات پر استدلال ممکن ہے۔ جن لوگوں نے حضرت مسیح کے نزول کو اسلامی تصور حیات میں جگہ دینے کی کوشش کی ہے، ان کا خیال ہے کہ حضرت مسیح کی دوبارہ آمد امت محمدی کے ایک فرد کی حیثیت سے ہوگی۔ اور ان کا کام شریعتِ محمدی کا نفاذ ہوگا۔

بعض روایتوں کے مطابق مسیح کا ظہور دمشق میں مشرق کی جانب کسی سفید منارے کے قریب ہوگا۔ آپ مصری طرز کے دو زعفرانی حلے زیب تن کئے ہوں گے اور اپنے دونوں ہاتھ دو فرشتوں کے بازوؤں پر رکھے ہوئے تشریف لائیں گے۔ بالوں سے پانی کچھ اس طرح ٹپکتا ہوگا جیسے ابھی ابھی حمام سے باہر آئے ہوں۔ بعض روایتوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ آپ نکاح کریں گے اور آپ کی اولاد ہوگی۔ چالیس برس بعد مدینہ میں وفات پائیں گے۔ بعض لوگوں نے تو حضرت عمر کے پہلو میں بھی آپ کا دفن ہونا لکھا ہے۔ ابن ابی واصل کے مطابق شیعوں کے امام منتظر یعنی مسیح المسائح سے مراد آپ ہی کی ذات ہے۔ بعض صوفیاء بھی لا مہدی الا عیسیٰ کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس قسم کے تصور کے عام ہونے میں بنیادی رول ان اطلاعات اور قصے کہانیوں کا ہے جو اصلاً عیسائی مآخذ سے آئے ہیں البتہ ہمارے یہاں کثرت نقل کی وجہ سے اب عام معلومات کا حصہ بن گئے ہیں۔ دوسری اور اہم تر وجہ یہ ہے کہ جو لوگ امت مسلمہ کے موجودہ زوال کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں ان کی یہ دلی خواہش ہے کہ ہم اپنے فکری انحراف کا ادراک کرنے کے بجائے کسی مسیح موعود کے انتظار میں بیٹھے رہیں۔

مؤطا امام مالک جو زمانی قربت کی وجہ سے حدیث کا مستند ترین مجموعہ ہے اس میں نزول مسیح سے متعلق کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ البتہ بخاری میں اس بارے میں دو روایات درج ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس میں حضرت مسیح کی وفات کا ذکر بھی موجود ہے۔ اس سلسلے کی پہلی حدیث کتاب بدء الخلق باب نزول عیسیٰ علیہ الصلاۃ

والسلام میں درج کی گئی ہے:

حدثنا محمد بن بشار حدثنا غُندر حدثنا شُعبةُ عن قتادة. وقال لي خليفة: حدثنا يزيد بن زُريع حدثنا سعيد عن قتادة عن ابي العالية حدثنا ابن عم نبيكم – يعني ابن عباس رضي الله عنهما – عن النبي ﷺ قال: "رأيتُ ليلةَ أُسْرِيَ بِيْ موسىٰ رجلاً آدمَ طُوالاً جعداً كأنه من رجالِ شنوءةَ، ورأيتُ عيسى رجلا مربوعا، مربوعَ الخلق الى الحمرة والبياض، سبط الرأس، ورأيتُ مالكاً خازنَ النار، والدجّال في آيات أراهنّ اللهُ اياهُ، فلا تكن في مرية من لقائه. قال أنس وأبوبكرة عن النبي ﷺ: تَحُرُسُ الملائكةُ المدينةَ من الدّجّال."

(بحوالہ فتح الباری فی شرح البخاری ص۳۶۲، کتاب بدء الخلق ج۶، قاہرہ ۱۹۸۸)

دوسری حدیث دجال کے حوالے سے کتاب الفتن میں موجود ہے:

عن عبد اللّٰه ابن عمر أن رسول الله ﷺ قال: بينا أنا نائم أطوف بالكعبة فاذا رجل آدمُ سبط الشعر ينطف– أو يهراقُ– رأسه ماء، قلتُ من هذا؟ قالوا: ابن مريم، ثم ذهبتُ ألتفت فاذا رَجُلٌ جَسيمٌ أحمرُ جعدَ الرأس أعورُ العين كأن عينه عنبة طافية، قالوا: هذا الدجال، أقربُ الناس به شبهاً ابنُ قَطَنٍ رجل من خُزاعة." (فتح الباری بشرح البخاری،ص۹۷، ج۱۳)

مگر ان دونوں جگہوں پر نہ تو کہیں نزول عیسیٰ کا ذکر ہے اور نہ یہ کہ دجال کو عیسیٰ بن مریم ہی قتل کریں گے۔ صرف رسول اللہ کے ایک خواب کا تذکرہ ہے جس میں آپؐ نے عیسیٰ بن مریم کو دیکھا تھا۔ علمائے حدیث نے ان دونوں حدیثوں کو رجال کی بنیاد پر کمزور قرار دیا ہے اس سلسلے کی تفصیلی بحث علامہ تمنا عمادی نے ''انتظار مہدی ومسیح'' میں کی ہے۔ اس کے علاوہ متقدمین میں ابن خلدون نے اس نظریے پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔ اور تاریخی اصولوں کی بنیاد پر یہ ثابت کیا ہے کہ اس قبیل کی احادیث کا سماجی پس منظر کیا تھا اور انہیں کیوں معتبر قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اس بارے میں ایک حدیث عمرو بن عاص کے حوالے سے صحیح مسلم میں نقل ہوئی ہے اور اسی قبیل کی ایک اور حدیث جابر بن عبداللہ کے حوالے سے بھی صحیح مسلم میں ہے۔ اس کے علاوہ اس قبیل کی ایک حدیث ابوداؤد میں ابوصریحہ حذیفہ بن اُسید کے حوالے سے موجود ہے۔ ترمذی اور ابن ماجہ بھی اس قبیل کی حدیثوں سے خالی نہیں۔ ان تمام حدیثوں کے روایان کو مشترکہ طور پر دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کثرت روایت اور نقل کے باوجود ان کے طرق محدود ہیں اور ان کے روایان میں ایسے ناموں کا جابہ جا اندراج موجود ہے جنہیں علمائے حدیث ثقہ قرار نہیں دیتے۔

مسلمانوں نے اپنے زوال کے عہد میں ایک مسیحا کے انتظار میں اگر پناہ لی ہے تو اس کی ایک بڑی وجہ مسلسل پسپائی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نفسیات ہے۔ جو لوگ آپسی خانہ جنگی سے پریشان ہوکر صرف اتحاد المسلمین کی خاطر بعض بڑے انحراف کو برداشت کرنے پر خود کو مجبور پاتے تھے، اور جن لوگوں نے بڑے بڑے اصحاب علم وفضل کی مسلسل مخالفت اور خروج کے باوجود خلافت کو دوبارہ منہاج النبوۃ پر قائم ہونے کے تجربے کی ناکامی دیکھ لی تھی۔ ان کے لئے ایک غیر معمولی اور عبقری شخصیت کے ظہور میں یقین کر لینا نفسیاتی طور پر کچھ مشکل نہ تھا۔ بالخصوص اگر اس نظریے کو کتاب وسنت کے لبادے میں پیش کیا گیا ہو۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہودی اور عیسائی روایتوں میں پہلے سے اس نظریے کو تقدس عطا کرنے کا وافر سامان موجود تھا۔ ابتدائی عہد میں چوں کہ اسرائیلیات کو ایک مثبت اور معروضی علم کی حیثیت سے اضافی مآخذ کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ اس لئے ظہور مسیح کا عیسائی عقیدہ جب وقت کے تناظر میں پیش کیا گیا تو بہت کم لوگوں پر اس خیال کی غلطی واضح ہوسکی۔ پھر یہ کہ مسیحا کی آمد کا خیال اہل کتاب کی معلومات کے علاوہ ایرانی۔ ہندی مآخذ میں بھی پایا جاتا تھا۔ لہٰذا غیر عربی روایتوں سے جو لوگ اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کے لئے اس تصور میں کوئی اجنبیت نہیں تھی۔ عیسائی مآخذ میں مسیح کی آمد ثانی سے متعلق اشاروں کا تذکرہ ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ میتھیو میں بڑی صراحت کے ساتھ حضرت مسیح کے بادلوں کے درمیان نزول کا تذکرہ موجود ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ آنے سے پہلے اپنے فرشتوں کو چہار دانگ عالم میں ندا لگانے کے لئے بھیج دیں گے۔ تاکہ ہر طرف سے ان کے مقربین ان کی آمد کے موقع پر جمع ہوسکیں۔ اسی قسم کی باتیں مارک 13/24 لوک 21/25 میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہودیوں کے مطابق آنے والے کا نام Imanual ہوگا۔ دانیال کے خواب کے مطابق وہ بھی بادلوں کے جلو میں آئے گا۔ جس کی آمد پر اہل یہود کی عظمت انہیں لوٹا دی جائے گی۔ یہودی عرصۂ دراز سے ایک ایسے جنگجو مسیحا کے منتظر تھے جو انہیں رومیوں کی غلامی سے نجات دلائے گا۔ گو کہ اب زمینی حالات بدل گئے ہیں۔ لیکن مسیحا کی واپسی کے تصور سے ابھی بھی یہودیوں کی جان نہیں چھوٹی ہے۔ زرتشت مذہب میں ساؤشیانٹ (Sao Shyant) بھی اسی قبیل کا ایک کردار ہے۔ جسے مادہ پرست دنیا میں روحانی زندگی کا احیاء کرنے کے لئے بھیجا جائے گا جو زرتشت کے مقابلے میں ایک عالمی مشن کا حامل ہوگا۔ کچھ اسی قسم کا تصور ہندوؤں میں کرشنا کے حوالے سے پایا جاتا ہے۔ بھگوت گیتا 4/78 اور وشنو پران 4/24 سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ کالی یگ میں جب دنیا ظلمتوں میں گھر جائے گی تب کرشنا دوبارہ نئے اوتار کی شکل میں ظہور پذیر ہوں گے۔

ہمارے خیال میں نزول مسیح میں عوام المسلمین کی دلچسپی اسی تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ابن حزم نے صحیح لکھا ہے کہ ''جو امت اپنی بداعمالی کی پاداش میں بدبختی کا شکار ہوجاتی ہے وہ بڑی یاس وحسرت کے ساتھ اپنی گذشتہ حالت کا انتظار کرتی ہے پھر وہ کافی عرصہ تک اس امید کے سہارے اپنے آپ کو مطمئن

کرتی رہتی ہے کہ کوئی نہ کوئی ہستی موعود ضرور آئے گی۔ اور وہ انہیں اس ذلت وپستی کے عالم سے نکال کر دوبارہ بام عروج تک پہنچا دے گی۔ چنانچہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ آخری زمانہ میں حضرت عیسیٰ بادلوں کے جلو میں آسمان سے نیچے اتریں گے اور عیسائیت کو تمام ادیان پر غالب کردیں گے۔ اسی طرح اہل تشیع کے نزدیک بھی یہ عقیدہ ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے کہ حضرت مہدی، جو ان کے بارہویں امام ہیں آخر زمانہ میں ظاہر ہوکر ساری دنیا کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے۔

(الملل والنحل.....بحوالہ انتظار مہدی ص ۱۰)

۲۳ تاریخ فہمِ قرآن میں کس طرح حارج ہوتی ہے اس کی بکثرت مثالیں کتب تفسیر میں موجود ہیں۔ جہاں ایک ہی آیت کے سلسلے میں مختلف اور متضاد واقعات منسوب ہیں۔ شانِ نزول کا تعین گویا وحی کو تاریخ کے تابع کردینا ہے جو یقیناً وحی کے مقابلے میں معلومات کا ایک کمتر اور غیر یقینی ذریعہ ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ تاریخی مصادر سے آیات کی شانِ نزول کے تعین نے ہماری قرآن فہمی میں اضافہ کیا ہو۔ اس کے برعکس ہوا یہ ہے کہ ان بیانات سے قرآنی آیات محدود پس منظر کی تابع ہوگئی ہیں۔ بسا اوقات قرآن کا طالب علم حیران و پریشان رہ جاتا ہے کہ وہ مفسرین کی بیان کردہ متضاد روایتوں میں سے کسے مستند قرار دے اور کس واقعے کو وہ اپنی قرآن فہمی میں کلید کے طور پر استعمال کرے۔ اس بارے میں تفصیلی بحث تو ہم اگلے باب میں کریں گے۔ یہاں صرف ایک مثال کے ذریعے اس بات کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ تاریخ کے ذریعے قرآن کو سمجھنے کی کوشش فہمِ قرآنی پر حجابات وارد کرسکتی ہے، ایسے غیر ضروری مباحث کے دفتر آباد کرسکتی ہے جس سے نکلنے کے لئے ہر عہد کے مفسرین اپنی سی تگ ودو کرتے رہے ہیں لیکن ہزار سالہ تفسیری ادب کے ارتقاء میں بھی وہ اب تک روایتوں اور حکایات کے ذریعے بُنے گئے جال کو کاٹنے میں کامیاب نہیں ہوسکے ہیں۔ اس خیال کی وضاحت کے لئے معاصر تفسیروں میں مشہور زمانہ تفہیم القرآن سے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ سورہ بروج میں **اصحاب الاخدود** کا جو تذکرہ آیا ہے اس سے کون سے لوگ مراد ہیں، یہ واقعہ کب پیش آیا، کہاں پیش آیا، یہ وہ سوالات ہیں جو ان مفکرین کے یہاں خصوصی توجہ کے مستحق سمجھے گئے، جو آیات کی تشریح وتعبیر میں تاریخی حوالوں یا شانِ نزول کے تعین کو کلیدی اہمیت دیتے ہیں۔ ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی قدیم مفسرین کی طرح اصحاب الاخدود کے سلسلے میں متضاد غیر معتبر روایتوں کو یکجا کردیا ہے۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ صہیب رومی کے حوالے سے ایک حکایت کی شکل میں نقل ہوا ہے جس میں قصہ گوئی کی چاشنی بھی ہے اور حرفی تحریک کے اثرات بھی۔ قصہ یوں ہے:

> ''ایک بادشاہ کے پاس ایک ساحر تھا۔ اُس نے اپنے بڑھاپے میں بادشاہ سے کہا کہ کوئی لڑکا ایسا مامور کردے جو مجھ سے یہ سحر سیکھ لے۔ بادشاہ نے ایک لڑکے کو مقرر کردیا۔ مگر وہ لڑکا ساحر کے پاس آتے جاتے ایک راہب سے بھی (جو غالباً پیروانِ مسیح علیہ السلام میں سے تھا) ملنے لگا اور

اس کی باتوں سے متاثر ہوکر ایمان لے آیا حتیٰ کہ اس کی تربیت سے صاحب کرامت ہوگیا اور اندھوں کو بینا اور کوڑھیوں کو تندرست کرنے لگا۔ بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لڑکا توحید پر ایمان لے آیا ہے تو اس نے پہلے تو راہب کو قتل کیا، پھر اس لڑکے کو قتل کرنا چاہا، مگر کوئی ہتھیار اور کوئی حربہ اُس پر کارگر نہ ہوا۔ آخر کار لڑکے نے کہا کہ اگر تو مجھے قتل کرنا ہی چاہتا ہے تو مجمع عام میں **باسمِ ربِّ الغُلام** (اس لڑکے کے رب کے نام پر) کہہ کر مجھے تیر مار میں مرجاؤں گا۔ چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور لڑکا مرگیا۔ اس پر لوگ پکار اٹھے کہ ہم اس لڑکے کے رب پر ایمان لے آئے۔ بادشاہ کے مصاحبوں نے اُس سے کہا کہ یہ تو وہی کچھ ہوگیا جس سے آپ بچنا چاہتے تھے۔ لوگ آپ کے دین کو چھوڑ کر اِس لڑکے کے دین کو مان گئے۔ بادشاہ یہ حالت دیکھ کر غصے میں بھر گیا۔ اس نے سڑکوں کے کنارے گڑھے کھدوائے، ان میں آگ بھروائی اور جس جس نے ایمان سے پھرنا قبول نہ کیا اس کو آگ میں پھینکوادیا''

(احمد، مسلم، نسائی، ترمذی، ابن جریر، عبدالرزاق، ابن ابی شیبہ، طبرانی، عبد بن حُمید)

اس قصے میں بیان ہونے والی تمام باتیں دین کے ایک ایسے مقبول عام edition کی پیداوار ہیں جن کی بنیاد خوش عقیدہ قصہ گو مفسرین نے رکھی ہے اور جو دراصل قرآن کو اس کے اصل فریضے اور مقام سے دور طلسم مباح کی لیک کتاب کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ اصحاب دین کا صاحب کرامت ہوجانا، اندھوں کو بینائی اور کوڑھیوں کو صحت عطا کرنا ایک ایسا خیال ہے جو قرآنی فریم ورک میں کسی اہلِ ایمان سے نہ تو مطلوب ہے اور نہ ہی اس قسم کے محیرالعقول کرامات پر قرآن سے دلیل لائی جاسکتی ہے۔ پھر وہ لڑکا جو صاحب ایمان تھا اس پر قتل کا تمام حربہ کارگر نہ ہونا ایک ایسا خیال ہے جس کی تصدیق قرآنی طرز فکر میں نہیں کی جاسکتی حتیٰ کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے قریب ترین صحابہؓ بھی ان طلسماتی قوتوں سے سرفراز نہیں کئے گئے جو اس صاحب ایمان لڑکے میں بتائی گئی ہیں۔ پھر اس لڑکے کا یہ کہنا کہ باسمِ رب الغلام کہہ کر اگر اسے ہلاک کیا جائے تو وہ مرجائے گا، دراصل یہ ایک ایسے گوسفندانہ ذہن کی پیداوار ہے جو قرآن مجید کے الفاظ اور آیات کو فی نفسہ قوتوں کا حامل سمجھتا ہے۔ اس خیال کے مطابق قرآن مجید کی بعض آیات کا ورد کرنے، گھول کر پلانے یا لکھ کر اپنے پاس رکھنے سے مختلف قسم کے فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں، یہ خیال دراصل قرآن مجید کو اس کے اصل وظیفہ ہدایت سے دور لے جانے کی پہلی منزل ہے۔ اس بارے میں تفصیلی بحث کے لئے چھٹا باب ملاحظہ فرمائیں۔

اصحاب الاخدود کے تعین میں ایک دوسرا واقعہ ان ہی تفسیری حواشی میں حضرت علیؓ کے حوالے سے نقل ہوا ہے:

''وہ فرماتے ہیں کہ ایران کے ایک بادشاہ نے شراب پی کر اپنی بہن سے زنا کا ارتکاب کیا اور

دونوں کے درمیان ناجائز تعلقات استوار ہوگئے۔ بات کھلی تو بادشاہ نے لوگوں میں اعلان کرایا کہ خدا نے بہن سے نکاح حلال کردیا ہے۔ لوگوں نے اسے قبول نہ کیا تو اس نے طرح طرح کے عذاب دے کر عوام کو یہ بات ماننے پر مجبور کیا، یہاں تک کہ وہ آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں ہر اس شخص کو پھینکواتا چلا گیا جس نے اسے ماننے سے انکار کیا۔ حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ اُسی وقت سے مجوسیوں میں محرمات سے نکاح کا طریقہ رائج ہوا ہے''۔ (ابن جریر)

تیسرا واقعہ ابن عباسؓ کے حوالے سے اس طرح نقل ہوا ہے:

''بابل والوں نے بنی اسرائیل کو دین موسیٰ علیہ السلام سے پھر جانے پر مجبور کیا تھا یہاں تک کہ انھوں نے آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں اُن لوگوں کو پھینک دیا جو اِس سے انکار کرتے تھے۔'' (ابن جریر، عبد بن حُمید)

چوتھا واقعہ طبری، ابن خلدون اور صاحبِ معجم البلدان کے حوالے سے جو بقول سید ابوالاعلیٰ مودودی سب سے مشہور واقعہ ہے، ایک بالکل ہی نئی کہانی سناتا ہے، اس کا خلاصہ خود صاحبِ تفسیر کی زبانی سنئے:

''حمیر (یمن) کا بادشاہ تُبان اسعد ابوکَرِب ایک مرتبہ یثرب گیا جہاں یہودیوں سے متاثر ہوکر اس نے دینِ یہود قبول کرلیا اور بنی قریظہ کے دو یہودی عالموں کو اپنے ساتھ یمن لے گیا۔ وہاں اس نے بڑے پیمانے پر یہودیت کی اشاعت کی۔ اس کا بیٹا ذونُواس اس کا جانشین ہوا اور اُس نے نجران پر، جو جنوبی عرب میں عیسائیوں کا گڑھ تھا، حملہ کیا تاکہ وہاں سے عیسائیت کا خاتمہ کردے اور اس کے باشندوں کو یہودیت اختیار کرنے پر مجبور کرے۔ (ابن ہشام کہتا ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ کے اصل دین پر قائم تھے)۔ نجران پہنچ کر اس نے لوگوں کو دینِ یہود قبول کرنے کی دعوت دی مگر انہوں نے انکار کیا۔ اس پر اس نے بکثرت لوگوں کو آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں پھینک کر جلوا دیا اور بہت سوں کو قتل کردیا، یہاں تک کہ مجموعی طور پر ۲۰ ہزار آدمی مارے گئے۔''

ان مختلف بیانات میں صاحبِ تفہیم القرآن کا رجحان چوتھے واقعے کی طرف ہے اور اسے ہی انھوں نے دیگر تاریخی حوالوں کی روشنی میں زیادہ قرین حقیقت بتانے کی کوشش کی ہے البتہ دوسرے قصوں کو بھی یکسر مسترد کردینا ان کے لئے ممکن نہیں ہوسکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے راویوں میں بڑے بڑے محدثین اور علمائے وقت کے نام شامل ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان ہی راویوں کی ایک روایت کو قابل اعتبار سمجھا جائے اور دوسری روایات کو نظرانداز کردیا جائے۔ ابوالاعلیٰ مودودی کا رجحان دراصل ان عیسائی مؤرخین کی تحریروں سے تشکیل پایا ہے جن کے تفصیلی تذکرے ان ہی حواشی میں موجود ہیں۔ اور جس کی

بنیاد آثارِ قدیمہ کے بعض کتبوں اور بعض قدیم یونانی کتابوں کی دریافت کا مرہون منت ہے۔ ہمارے نزدیک تاریخ ایک مسلسل نمو پذیر علم ہے۔ نئے حقائق پرانے حقائق کو رد کر دیتے ہیں اور اچانک کسی نئی دریافت سے قدیم مذہبی تاریخ کا ایک نیا باب نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ *Dead Sea Scrolls* اس قبیل کی ایک دل چسپ مثال ہے۔ تاریخ کو وحی کے شارح کی حیثیت دینے سے نہ صرف یہ کہ ہم غیر ضروری تاریخی تفصیلات کی تلاش میں اپنی بہترین قوتیں ضائع کرتے ہیں بلکہ ہمارا یہ عمل مسلسل فہمِ وحی میں حارج ہوتا رہتا ہے۔ مزید ملاحظہ کیجئے، حوالہ ۱۴۲، باب ۳۔